تنظیمِ اسلامی

فروری ۲۰۰۷ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

فرقہ وارانہ ہم آہنگی: وقت کی ضرورت

فرقہ وارانہ کشیدگی کا معاملہ دورِ حاضر میں ایک سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس ضمن میں بھرپور اصلاحی اقدامات وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان اسباب وعوامل کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا جائے جو موجودہ کشیدہ صورت حال کا موجب بنے ہیں اور پھر ان کے تدارک کے لیے مل جل کر جدوجہد کی جائے۔

ہماری رائے میں دیگر عوامل واسباب کے ساتھ ساتھ اس کا ایک نہایت اہم سبب یہ ہے کہ آج طاغوتی طاقتیں اسلام کا وجود مٹانے کے درپے ہیں، چنانچہ مسلمانوں کو کمزور کرنے اور اسلام کی بنیادوں کو منہدم کرنے کے لیے انہوں نے جو ہمہ جہتی لائحۂ عمل اختیار کیا ہے اس ضمن میں ایک نہایت اہم لائحۂ عمل جوان کے چوٹی کے پالیسی ساز اداروں نے مرتب کیا ہے، یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دی جائے اور مختلف سازشی ہتھکنڈوں کے ذریعے فرقہ واریت کی آڑ میں انہیں ایک دوسرے سے لڑایا جائے۔ چنانچہ گزشتہ برسوں میں ہمارے ملک میں تخریب کاری اور دہشت گردی کے اکثر واقعات، جو بظاہر فرقہ وارانہ کشیدگی کی آڑ میں ہوئے، اصلاً اسلام دشمن طاقتوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں مثلاً ''را'' اور ''موساد'' وغیرہ کی کرشمہ سازیاں تھیں، جنھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک عرصہ تک مساجد اور امام بارگاہوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کو باہم لڑانے اور ان کے مابین کشیدگی کو بھڑکانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اصلاً ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان میں موجود تمام مذہبی مسالک کے چوٹی کے علماء اور قائدین اسلام دشمن طاقتوں کے ان ناپاک عزائم اور ان کے مختلف ہتھکنڈوں کو پہچانیں اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ الحمد للہ کہ ہمارے دینی طبقات میں اب یہ شعور بیدار ہونے لگا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم ذمہ داری حکومت وقت پر بھی عائد ہوتی ہے۔

''اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!''

نائن الیون کے بعد امریکی مہم جوئی کا مقصد اسلام کا خاتمہ ہے۔ اس مہم میں مسلم حکمرانوں کا امریکہ کی مدد کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی حکمرانوں نے امریکہ کو اپنا رب تسلیم کر لیا ہے' جس کی خوشنودی کے لیے کبھی میراتھن ریس کرائی جا رہی ہے تو کبھی بسنت کا تہوار منانے پر اصرار ہے۔ گویا یہی وقت کے سب سے بڑے مسائل ہیں' حالانکہ ان دونوں مواقع پر اہل لاہور کو جس اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔

ہمیں اسلامی نظام کے قیام کے لیے پاکستان جیسی نعمت ملی لیکن ہم نے اس کی قدر نہ کی اور اپنی خوش بختی کو بدبختی میں تبدیل کر لیا۔ چنانچہ یہاں دین کو نافذ نہ کرنے کی سزا یہ ملی کہ آج پاکستانیوں کو پوری دنیا میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُمت مسلمہ کی موجودہ ذلت وخواری کا سبب بھی یہی ہے' کیونکہ قرآن کا دوٹوک اعلان ہے کہ کتاب وشریعت کے کچھ حصے پر عمل اور کچھ احکامات کے انکار کی سزا دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں سخت ترین عذاب ہے۔ دراصل نبی اکرم ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو دین کی طرف بلانے کے لیے امت مسلمہ کو منتخب فرمایا ہے۔ لیکن امت اپنی دینی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی بجائے دنیا پرستی اور دولت پرستی میں مبتلا ہے۔ اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں عالم کفر کے ہاتھوں رسوائی کی سزا مل رہی ہے۔

موجودہ مسائل اور پریشانیوں سے نکلنے اور کفر کا مقابلہ کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کے لیے پہلے خود دین پر عمل پیرا ہوں اور پھر نوع انسانی تک اللہ کے پیغام کو پہنچانے اور دین حق کے قیام کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو گیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکے گی۔ oo

سیرت النبی ﷺ

سلسلۂ تقاریر ①

منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے ۷/اپریل تا ۹ جون ۱۹۷۸ء (مطابق محرم تا ربیع الاول ۱۳۹۸ھ) کے دوران ماڈل ٹاؤن لاہور کی مختلف مساجد میں سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر دس تقاریر فرمائیں۔ یہ مربوط سلسلۂ تقاریر قبل ازیں ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوران میثاق میں شائع ہو چکا ہے۔ اب ان تقاریر کو مزید ایڈیٹنگ کے بعد دوبارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پیش نظر تقریر ''منصبِ رسالت اور اس کا مقصد'' اس سلسلۂ تقاریر کی پہلی کڑی ہے۔

تاریخ کے صحیح فہم کی ضرورت و اہمیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اُس کے افراد کو خود شناسی کی دولت عطا کرتی ہے! یعنی اگر کوئی قوم یا کوئی اُمت اپنی تاریخ سے غافل اور ذہناً غیر متعلق ہو جائے تو یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے آپ سے غافل ہو جائے اور اپنے آپ کو بھول جائے' بالفاظِ دیگر خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ تاریخ درحقیقت کسی قوم کی اجتماعی یادداشت ہوتی ہے' جس سے اُس قوم کے افراد کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہماری روایات کیا ہیں..... ہم اگر کوئی بامقصد گروہ یا جماعت تھے تو ہمارا وہ مقصد کیا تھا اور اس کے اعتبار سے ہم اِس وقت کہاں کھڑے ہیں..... اور ہماری اجتماعی جدوجہد کا رُخ کیا ہونا چاہیے؟ یہ تمام اُمور درحقیقت اپنی تاریخ کے صحیح فہم ہی سے اس قوم کو میسر آ سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی قوم اپنی تاریخ سے غافل ہو جائے یا اس کا کوئی مسخ شدہ تصور

(distorted version) اس کے سامنے رہے تو اس کے معانی یہ ہیں کہ وہ قوم اپنے اجتماعی نصب العین سے غافل ہے۔ مجھے یہاں اس امر کی زیادہ وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کوئی قوم کسی اجتماعی نصب العین کے بغیر اپنا وجود باوقار اور باعزت طور پر برقرار نہیں رکھ سکتی' چاہے برائے نام زندہ رہنے کو وہ بے شک رہے' اس طرح کہ نہ اس کا کوئی وقار ہو اور نہ کوئی عزت' نہ دنیا میں اس کی کوئی حیثیت ہو' نہ اقوامِ عالم میں اسے کسی معاملے میں کوئی اہمیت حاصل ہو' جیسے کہ اِس وقت ہم جی رہے ہیں۔ باعزت و باوقار قوم وہی ہوگی جس کے سامنے کوئی اجتماعی نصب العین ہو۔ اس سلسلۂ تقاریر کی اصل غرض و غایت یہی اجتماعی خود شناسی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کا ایک مشہور مصرع ہے: ع ''اپنی خودی پہچان او غافل افغان!'' یہی بات ایک مسلمان سے بھی کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے کہ مَیں کون ہوں' کس اُمت سے میرا تعلق ہے' میرا اجتماعی نصب العین کیا ہے' میرا ماضی کتنا شاندار تھا اور میرے اَسلاف کی روایات کتنی عظیم تھیں! وہ غور کرے کہ مَیں کتنے عظیم ورثے کا وارث ہوں اور میرے سامنے جدوجہد اور اجتماعی سعی کے لیے نقشہ کیا ہے: ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

یہ تمام باتیں وہی ہیں جو درسِ قرآن کے ضمن میں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں۔ درسِ قرآن کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم سمجھیں کہ بحیثیتِ اُمت مسلمہ ہمارا مقام کیا ہے اور ہمارے فرائض کیا ہیں؟ اور یہی درحقیقت پیشِ نظر ہے اس سلسلۂ تقاریر سے کہ یہ بات سیرت اور تاریخ کے حوالے سے بھی مبرہن اور مدلّل ہو کر سامنے آجائے۔ یعنی مقصد وہی ہے' جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے بیان کیا ہے: ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!

یہ شعر و سخن' یہ غزل گوئی مقصود نہیں: ؎

من اے میر اُممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند!

علامہ اقبال سردارِ اُمم نبی اکرم ﷺ کے حضور فریاد کناں ہیں کہ مجھ پر تو ظلم کیا ہے میرے ساتھیوں اور دوستوں نے کہ مجھے غزل خواں اور شاعر سمجھ لیا ہے۔ کیسا پیارا انداز ہے علامہ اقبال کے احتجاج کا! کہتے ہیں: ع ''شاعری زیں مثنوی مقصود نیست!'' کہ شعر و سخن سے میرا مقصد محض شاعری نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ: ع ''سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!'' بڑی پیاری تشبیہ ہے۔ ایک قافلہ تھا' جو ایک منزل کی طرف گامزن تھا' اُس کی اونٹنیاں منتشر ہوگئیں' جس کا جدھر مُنہ اٹھا چل پڑی' قافلہ درہم برہم ہوگیا۔ مقصود اس سب سے یہ ہے کہ پھر وہ قافلہ وجود میں آئے اور اپنی منزل کی سمت میں اپنے سفر کا آغاز کر سکے۔ معلوم ہو کہ اس قافلے کی منزل کون سی ہے تاکہ قدم سے قدم ملا کر یہ اُمت اس کی طرف بڑھ سکے۔

اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کی اساس و بنیاد

ہماری تاریخ' اگر اسے تاریخِ اسلام کہا جائے' اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ نوعِ انسانی کی تاریخ۔ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ ہے کہ اسلام کا آغاز نبی اکرم ﷺ سے ہوا۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اسلام کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے' اس لیے کہ از روئے قرآن پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا۔ تو گویا تاریخِ نبوت تاریخِ آدمیت ہے اور اس کو آپ چاہیں تو تاریخِ اسلام کہہ لیں۔ سب انبیاء کا ایک ہی دین تھا۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾

(الشوریٰ:۱۳)

''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے ہم نے وہی دین معین کیا ہے جس کی وصیت ہم نے نوحؑ کو کی تھی اور جسے (اے محمدؐ) اب آپ کی طرف ہم نے بذریعہ وحی بھیجا

ہے‘ اور جس کا حکم ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کر چکے ہیں‘ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!‘‘

یہ ایک ہی دین ہے اور تمہارا فرض یہ ہے کہ اِس دین کو قائم کرو‘ قائم رکھو‘ اور اس کے بارے میں آپس میں تفرقے میں مبتلا مت ہو جاؤ۔ تو دین ایک ہی ہے ’’دین اسلام‘‘۔

تاریخِ اسلام کا آغاز یوں تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا‘ اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تاریخِ نبوت ہی تاریخِ آدمیت ہے۔ البتہ اُمت مسلمہ کی تاریخ کا آغاز محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اُمت کی تاریخ کو نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے تناظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک پس منظر ہے‘ اگر اس کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے تو اس اُمت کی تاریخ کا صحیح فہم حاصل نہیں کیا جا سکتا اور آپ اس کے مختلف اَدوار کا تعین نہیں کر سکتے کہ اُن کا کیا مقام اور کیا مرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک مشہور قول اکثر خطباتِ جمعہ میں نقل ہوتا ہے:

((خَيْرُ أُمَّتِي [وَفِي رِوَايَةٍ : خَيْرُ النَّاسِ] قَرْنِي ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ)) (۱)

’’میری اُمت کے بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں‘ پھر وہ لوگ جو اس سے متصل ہوں گے‘ پھر وہ جو اس سے متصل ہوں گے‘‘۔

اس کا تعین دراصل نبی اکرم ﷺ کے مشن اور آپؐ کے مقصدِ بعثت کے اعتبار سے ہوتا ہے‘ اس لیے کہ خیر القرون یعنی دَورِ نبویؐ کے بعد دَورِ خلافتِ راشدہ ہے۔ دَورِ خلافتِ راشدہ کا اصل مقام و مرتبہ کس اعتبار سے ہے‘ اس کی اصل فضیلت کی بنا کیا ہے‘ نبی اکرم ﷺ کے مشن میں اس کا کردار (role) اور اس کا حصہ (contribution) کیا ہے‘ اس کو صرف اُس وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ خود نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کو سمجھ لیا جائے۔

مسلمانوں کی تاریخ کسی ایک قوم کی تاریخ نہیں ہے‘ اس میں بہت سی اقوام کی

---

(۱) صحيح البخاری‘ كتاب المناقب‘ باب فضائل اصحاب النبی ﷺ ۔ وصحيح مسلم‘ كتاب فضائل الصحابة ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم۔ عن عمران بن حصين رضی اللہ عنہ وعن عبداللّٰه بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

تاریخ شامل ہے۔ اگر لفظ قوم ہی استعمال کرنا ہے تو عربوں کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' ترکانِ سلجوقی کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' ترکانِ عثمانی کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' ترکانِ تیموری کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' بربروں کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے۔ بہت سی اقوام کی تاریخ مل کر مسلمانوں کی تاریخ بنتی ہے۔ لیکن جب آپ اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کو سمجھنا چاہیں گے تو اس کو اسی حوالے سے سمجھا جا سکے گا کہ اس اُمت کی غرضِ تأسیس کیا تھی' اس کو برپا کس لیے کیا گیا' اس کا اجتماعی نصب العین کیا تھا اور اس حوالے سے اس کی تاریخ کے اَدوار کون کون سے ہیں۔ مختلف قوموں کا عروج و زوال اپنی جگہ پر' سوال یہ ہے کہ اُس مشن کا کیا معاملہ ہوا جو محمد عربی ﷺ اپنی اُمت کے حوالے کر کے گئے تھے' اور پھر اس کے حوالے سے معین کیا جائے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل گوناگوں ہیں' متنوع ہیں' طرح طرح کے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ وہ ہے' جیسے کہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ)) (۱) ''جو شخص اپنے تمام تفکرات کو ایک فکر میں گم کر دے' یعنی اپنی آخرت کی فکر' اللہ تعالیٰ اُس کے تمام دُنیوی تفکرات کو دُور فرما دے گا''۔ اس کی ساری ضروریات کی کفالت وہ خود فرمائے گا۔ اسی طرح اُمت کے مسائل بہت ہیں' لیکن ان میں جو اصل مسئلہ ہے پہلے اس کا شعور ہو' اس کا تعین ہو' اس کو سمجھا جائے اور یہ بات سامنے آ جائے کہ بقیہ سارے مسائل اسی ایک مسئلے میں گم ہو سکتے ہیں' بلکہ یہ سب مسائل پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس ایک مسئلے سے اغماض برتا گیا ہے' اس کو ترک کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات سامنے آئے تو یہ ہے درحقیقت تاریخ کے مطالعہ کا کوئی فائدہ۔ مَیں اس سلسلۂ تقاریر میں کوشش کروں گا کہ ان ہی مسائل پر اس خاص پس منظر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا' ہمارے نزدیک تو پوری تاریخ انسانی بھی تاریخ نبوت ہے' اور پھر مسلمانوں کی تاریخ کی اساس و بنیاد تو سیرتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

(۱) سنن ابن ماجه' المقدمة' باب الانتفاع بالعلم والعمل به۔ عن عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

ہے۔تو سب سے پہلے ہم یہ سمجھیں گے کہ از روئے قرآن بعثتِ انبیاء کا مقصد اور سلسلۂ رسالت کی غرض و غایت کیا ہے۔اس کے بعد اِن شاء اللہ اس پر گفتگو ہو گی کہ نبوت و رسالت کا حضرت محمد ﷺ پر جو اتمام و اکمال ہوا ہے جس کے نتیجے میں ختمِ نبوت واقع ہوئی' اس کے کیا لوازم ہیں' کیا نتائج ہیں اور اس کی کیا implications ہیں۔پھر اِن شاء اللہ سیرت النبی ﷺ کا واقعاتی انداز میں بیان ہو گا۔پھر اس کے پس منظر میں خلافتِ راشدہ کا اور پھر تاریخ اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بیان ہو گا۔

منصبِ رسالت

آج کے موضوع کے ضمن میں پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ نبوت اور رسالت دو الفاظ بھی ہیں' دو اصطلاحات بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک جداگانہ مفہوم بھی ہے' لیکن میری آج کی گفتگو کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مترادف یا ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔ہمارے ہاں یہ ایک بڑا علمی مسئلہ رہا ہے کہ آیا نبوت و رسالت بالکل ہم معنی الفاظ ہیں یا ان کے مفہوم مختلف ہیں—اور اگر ان میں کوئی فرق اور امتیاز ہے تو کس بنیاد پر؟ اس بارے میں میری بھی ایک رائے ہے جو میں مختلف اوقات پر ظاہر کرتا رہا ہوں۔اجمالاً یہ کہ نبوت ایک ذاتی حیثیت اور ایک ذاتی مرتبہ ہے جبکہ رسالت ایک فرضِ منصبی ہے۔اس کی وضاحت میں ایک سادہ سی مثال سے یوں کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں خصوصی تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ایک C.S.P کا ڈر (cadre) ہے۔جو اس کو qualify کر لیتے ہیں وہ اس خاص سطح اور مرتبہ پر آ جاتے ہیں۔ان میں سے کوئی ڈپٹی کمشنر لگا دیا جاتا ہے اور کسی کی سیکرٹری کی ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے' لیکن اس کا معین کاڈر (C.S.P) برقرار رہتا ہے۔اس اعتبار سے نبوت ایک مرتبہ ہے اور رسالت وہ منصب ہے جب ایک نبی کو معین طور پر کسی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ذاتی حیثیت میں وہ نبی ہے اور اس منصب کے لحاظ سے وہ رسول ہے۔یہ بات تو ہمارے ہاں مجمع علیہ ہے کہ ہر رسول لازماً نبی بھی ہوتا ہے' مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ایک نبی ذاتی حیثیت میں تو نبی ہے' لیکن جب اس کا تعین ہو گیا

(مثلاً: اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ) تو اب وہ رسول ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ﴿رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَاءِ یْلَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا﴾ ''اور ہم نے قوم مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا''۔ سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں ان دونوں الفاظ (نبی اور رسول) کو کیسے سمو دیا گیا ہے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾﴾

''اے نبیؐ! ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر''۔

یعنی ذاتی حیثیت میں نبی اور بھیجے جانے کی حیثیت میں رسول۔ یہاں پر یہ فرق ذہن میں رکھئے کہ بقیہ تمام رسول کسی معین قوم کی طرف بھیجے گئے جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو پوری نوعِ انسانی کی جانب مبعوث فرمایا گیا اور قرآن میں اس کے بارے میں صراحت فرما دی گئی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) ''اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔

ایمانیاتِ ثلاثہ میں ایمان بالرسالت کا مقام

مرتبۂ نبوت اپنی جگہ پر ایک مستقل اور بڑا طویل مضمون ہے۔ مراتبِ چہارگانہ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سب سے اونچا مرتبہ نبوت کا ہے۔ میری آج کی گفتگو درحقیقت منصبِ رسالت سے متعلق ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے پہلے ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کے مابین منطقی ربط و تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایمان بالرسالت اس کُل کا ایک جزو ہے اور تینوں اجزاء باہم مربوط ہیں، ان کا بڑا گہرا ربط ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا نتیجہ جو نکلتا ہے اس کے بہت سے پہلو ہیں۔

حیاتِ انسانی کے بارے میں ان دونوں کو جمع کرنے سے ایک بات متعین ہوتی ہے‘ اسے نظریۂ حیات کہہ لیں‘ نظریۂ زندگی کہہ لیں‘ کہ انسانی زندگی صرف پچاس ساٹھ سال کا عرصہ نہیں ہے‘ بلکہ یہ ایک بڑا طویل سفر ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے۔ یہ ہے اصل میں انقلابی نتیجہ جو ایمان پر مترتب ہوتا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ (العنکبوت) ’’اصل زندگی کا گھر تو آخرت کا ہے‘ کاش انہیں معلوم ہوتا‘‘۔ اس سے زندگی کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کے نزدیک اصل زندگی یہی ہے‘ یعنی پیدائش سے لے کر موت تک‘ جبکہ ایک کے نزدیک یہ تو کتابِ زندگی کا دیباچہ ہے‘ مقدمہ ہے‘ تمہید ہے‘ اور اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ اب جو اصل زندگی ہے ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (الاعلیٰ) اس کا کل دار و مدار اسی نظریے پر ہے۔ انسان وہاں عافیت میں رہے گا یا تکلیف میں رہے گا‘ ﴿فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ اس کے نصیب بنیں گے یا ﴿تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾﴾ (الواقعۃ) اس کا انجام بنے گا۔ ابدالآباد تک کی راحت یا ہمیشہ ہمیش کے لیے عذاب‘ اس کا فیصلہ یومِ آخرت کو ہوگا۔ چنانچہ ایمانیات میں مرکزی اور محوری (pivotal) حیثیت ایمان بالآخرۃ کو حاصل ہے۔ ’’ایمان مفصل‘‘ کے الفاظ ہیں: آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ. اس یومِ آخر کا محاسبہ ہی فیصلہ کن ہے۔ جو اُس روز کامیاب ہوا وہ کامیاب اور جو اُس روز ناکام ہوا وہ ناکام اور تباہ و برباد قرار پائے گا۔ سورۃ التغابن میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن!) اب آپ سوچئے ایمان اگر واقعتاً قلب و ذہن میں شعوری سطح پر کچھ بھی جگہ بنالے تو انسان کی سوچ کس قدر بدل جائے گی! اس کی اقدار (values) بدل جائیں گی‘ نقطۂ نظر بدل جائے گا۔ اصل

فیصلہ کن چیز یہی ایمان بالآخرۃ ہے۔

یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا' کون کامیاب رہا اور کون ناکام' اُسی دن ہوگا۔ لیکن اس دن کے محاسبے کی بنیاد کیا ہے؟ فلسفۂ رسالت کو سمجھنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ دیکھئے' امتحان لیا جاتا ہے کچھ پڑھا کر' حساب لیا جاتا ہے کچھ دے کر۔ یہ جو محاسبہ ہے جس کی رو سے یہ زندگی ایک امتحانی وقفہ بن گئی ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اِس امتحان کی بنیاد کیا ہے' محاسبۂ اُخروی کی اساس کیا ہے؟ قرآن مجید ان موضوعات پر روشنی ڈالتا ہے' یہ بنیادی باتیں ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۲﴾ (الدّھر)

''ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا' تاکہ اسے آزمائیں' پس ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے''۔

فَجَعَلْنٰهُ میں کلمہ فاء (پس) بہت اہم ہے۔ جب امتحان لینا ہے تو کچھ صلاحیتیں دی ہیں' ذمہ داری ڈالی ہے تو کچھ استعداد بھی پیدا کی ہے' مسئول بنایا ہے تو کچھ دے کر بنایا ہے۔ فرمایا ہم نے اسے سمیع اور بصیر بنایا ہے' سماعت اور بصارت دے کر بھیجا ہے' عقل اور شعور کی قوتیں دے کر بھیجا ہے' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خیر و شر کی معرفت اور تمیز دے کر بھیجا ہے' انسان اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اسے بتائے کہ یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے۔ سورۃ الشّمس میں فرمایا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾

''قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جو اسے ہموار کیا (اس کی نوک پلک سنواری)۔ پھر اُس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی''۔

اسے فجور اور تقویٰ کا علم الہامی طور پر دیا گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بدی کیا ہے اور نیکی کیا ہے' شر کیا ہے اور خیر کیا ہے۔ انسان اندھا بہرہ نہیں ہے کہ بغیر کوئی امداد دیے اسے

امتحان کی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہو۔ ایسا ہوتا تو یہ ظلم ہوتا۔ انسان کے اندر کچھ داعیاتِ شر بھی ہیں: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ لیکن اس کے اندر وہ روحِ ملکوتی بھی ہے جو اسے نیکی اور خیر کی طرف کھینچتی ہے۔ جہاں نفسِ امارہ اسے پستی کی طرف' عالمِ سفلی کی طرف' برائی کی طرف کھینچنے والا ہے' وہیں روحِ ملکوتی اُسے عالمِ علوی اور عالمِ ملکوت کی طرف پرواز کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح یہ بات تو بہت معلوم ومعروف ہے' کون مسلمان نہیں جانتا ہوگا کہ خارج میں کچھ غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو انسان کو شر کی طرف بلانے والی ہیں۔ جنات ہیں' خصوصاً اُن کا گروابلیسِ لعین ہے' جو شر کی طرف بلانے والا' برائی کو مزین کر کے دکھانے والا' بے حیائی کی رغبت دلانے والا' نفرتیں اور کدورتیں پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن حکیم میں بار بار متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (المائدۃ:۹۱)

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے''۔

ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (البقرۃ:۲۶۸)

''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے''۔

سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ (آیت ۲۷)

''وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے''۔

وہ اور اس کی صلبی اور معنوی ذریت تم پر حملہ کرتے ہیں اور تمہارے لیے گھات میں بیٹھتے ہیں' جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے۔ اسی طرح غیر مرئی قوتیں خیر کی بھی موجود ہیں۔ یہ

حقیقت اس دَور میں کچھ عقلیت پسندی (rationalism) اور کچھ سائنسی طرزِ فکر کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے‘ لیکن یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ ملائکہ ہیں جو خیر کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ نیکوں کی پیٹھ ٹھونکنے والے‘ انہیں شاباش دینے والے اور ان کی تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بننے والے ہیں۔ جیسا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: ﴿فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الانفال:۱۲) ’’پس تم اہل ایمان کے پاؤں جما دو‘‘۔ اور پاؤں تبھی جمتے ہیں جب دل جما ہوا ہو۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اہل ایمان پر ملائکہ کے نزول کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾

’’یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے‘ پھر اس پر جم گئے‘ اترتے ہیں ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کہ نہ غم کھاؤ اور نہ خوف‘ اور بشارت حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا‘‘۔

یوں سمجھئے ایک جنگ ہے خیر و شر کے درمیان‘ انسان کے اندر بھی اور خارج میں بھی۔ اندر خیر کی طاقت بھی ہے اور شر کی بھی‘ باہر بھی داعیانِ خیر بھی ہیں اور داعیانِ شر بھی۔ گویا بڑی ہی متوازن قسم کی قوتیں ہیں جو ایک دوسرے کو balance کر رہی ہیں۔

رسولوں کی بعثت کا مقصد: شہادت علی الناس

ان حالات میں جبکہ شر کی طاقت موجود ہے تو خیر کی طاقت بھی ہے‘ انسان کو سماعت اور بصارت بھی دی گئی ہے‘ عقل و شعور کی قوتیں بھی عطا کی گئی ہیں اور نیکی اور بدی کی تمیز بھی عطا کی گئی ہے‘ ہر انسان اپنی جگہ پر مسئول ہے‘ ذمہ دار ہے‘ جواب دہ ہے‘ خواہ کوئی نبی آتا یا نہ آتا‘ کوئی وحی نازل ہوتی یا نہ ہوتی‘ کسی رسول کو بھیجا جاتا یا نہ بھیجا جاتا۔ انسان مسئول ہے اُن استعدادات کی بنا پر جو قدرت نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔ یہاں وہ اشکال حل ہو جاتا ہے جو بعض حضرات کو پیش آتا ہے کہ جن لوگوں تک کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی ان کا محاسبہ کیسے ہوگا؟ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داعیاتِ خیر

وشر انسان کے اندر رکھ دیے۔ اب وہ ذمہ دار ہے' جدھر جا رہا ہے اس کا بدلہ اسے مل کر رہے گا' سزا ہو یا جزا ہو۔ اس کے بعد انسان پر کوئی اور ہدایت' کوئی نبوت' کوئی رسالت' کوئی وحی عدل کا تقاضا نہیں۔ البتہ رحمتِ خداوندی متقاضی تھی کہ مزید رہنمائی کے لیے رسالت و نبوت کا سلسلہ جاری کیا جاتا۔ اس اعتبار سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الحج)۔

نبوت و رسالت درحقیقت رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے' عدلِ خداوندی کا نہیں۔ عدلِ خداوندی تو اس اعتبار سے بھی مکمل ہے کہ انسان کو امتحان میں ڈالا ہے تو نہتا نہیں ڈالا' غیر مسلح نہیں ڈالا' بغیر کچھ دیے اس آزمائش میں مبتلا نہیں کیا' بلکہ یہ سب کچھ دے کر بھیجا ہے۔ انبیاء و رُسلؑ کی بعثت تو درحقیقت قطع عذر اور اتمامِ حجت کے لیے ہوتی ہے' تاکہ انسان کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی حجت' کوئی بہانہ' کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ اس ضمن میں سورۃ النساء کی آیات ۱۶۳ تا ۱۶۵ بڑی اہم ہیں کہ اس مقام پر انبیاء و رُسل کا نام بنام ذکر کیا گیا اور اس کے بعد فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا﴾

''ان رسولوں کو ہم نے بھیجا خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر تاکہ ان رسولوں کی بعثت کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے' اور اللہ تو غالب رہنے والا حکیم و دانا ہے''۔

یہ دونوں الفاظ (مبشر اور منذر) قرآن مجید میں رسولوں کے بارے میں بکثرت آئے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا﴾ ''(اے نبیؐ!) ہم نے تو آپ کو بھیجا ہی مبشر اور منذر بنا کر ہے''۔ سورۃ الکہف میں اس کو جمع کے صیغے میں لائے: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ﴾ (آیت ۵۶) ''اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر''۔

سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت میں رسولوں کو مبشر اور منذر بنا کر بھیجے جانے کی غرض و غایت یہ بیان کی گئی: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ ''تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل (کوئی بہانہ' کوئی عذر) رسولوں کی بعثت کے بعد''۔ عربی زبان میں ''ل'' اور ''علیٰ'' کا استعمال ایک دوسرے کی ضد کے طور پر ہوتا ہے۔ ایک حجت' ایک دلیل کسی کے حق میں ہے تو کسی کے خلاف ہے۔ جیسے ایک شہادت' ایک گواہی کسی مقدمے کے فریقین میں سے کسی کے حق میں جائے گی تو کسی کے خلاف جائے گی۔ جس کے حق میں ہوگی اس کے لیے ''ل'' اور جس کے خلاف ہوگی اس کے لیے ''علیٰ'' کا حرف آئے گا۔ یہاں حجت کے ساتھ دونوں حرف اکٹھے آ گئے ہیں' جیسے ایک حدیث میں بھی دونوں آتے ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَيْکَ))(۱) ''قرآن یا تو حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف''۔ اس کو اپنا امام اور رہنما بناؤ گے تو یہ تمہارے حق میں دلیل ہوگا۔ لیکن اگر اس کے حقوق ادا نہیں کرو گے' یا اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے باوجود غلط راستے پر چلو گے تو یہ تمہارے خلاف دلیل ہوگا۔ اسی طرح یہاں فرمایا کہ ان رسولوں کو ہم نے مبشر اور منذر بنا کر بھیجا'' تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں' لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل۔'' یعنی لوگ اللہ کے حضور پیشی کے وقت یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اے اللہ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے۔ اے اللہ! ہم تو نہیں جانتے تھے کہ یہ چیز تو نے حرام کی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ ''اور اللہ تعالیٰ عزیز (یعنی زبردست) بھی ہے (اور) حکیم بھی ہے''۔ وہ زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' جیسے چاہے محاسبہ کرے' جیسے چاہے پرسش کرے کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا' لیکن وہ حکیم بھی ہے۔ اُس نے محاسبے کے لیے جو بنیادیں معین کی ہیں وہ اس کی حکمت پر مبنی ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔ و سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ ﷺ۔

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ﴾ کے الفاظ کا فلسفۂ نبوت و رسالت کے ساتھ بڑا گہرا ربط ہے۔ قرآن کے نزدیک انسانی ارادہ (human will) آزاد ہے۔ ﴿اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا﴾ کے مصداق چاہے تو انسان شکرگزاری کی راہ اختیار کرے‘ فرماں برداری کی روش اپنائے‘ اور چاہے تو کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرے‘ سرکشی اور بغاوت کی راہ پر چلے‘ دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اصل چیز انسان کا فیصلہ ہے۔ کوئی چیز بھی ثانوی درجے میں خیر یا شر کے لیے مؤید ہوسکتی ہے۔ انسان کے لیے کسی پہلو سے بھی نہ کسی داعیٔ شر کو اور نہ کسی داعیٔ خیر کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے شیطانِ لعین کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ﴾ (الحجر)

’’میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں‘ سوائے اس کے جو تیرا اتباع کرے اور جو بہکے ہوئے لوگوں میں سے ہو‘‘۔

جن کی سوچ اور طلب خود کج ہو چکی ہو اور وہ تیرا اتباع کریں‘ انہیں تو تو جہاں چاہے لے جا‘ جس کھائی میں چاہے لے جا کر گرا دے‘ لیکن میرے بندوں پر جو میرے راستے پر چلنا چاہیں تجھے کوئی اختیار نہیں۔

یوں سمجھئے کہ خارج کے داعیانِ شر میں سب سے بڑا ابلیس لعین ہے‘ اور خارج کے داعیانِ خیر میں جو شخصیت اتمامِ حجت کے درجے میں رسالت و نبوت کے منصب پر اپنے معیارِ کمال کو پہنچی وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مبارکہ ہے۔ اُن کو بھی صاف صاف بتا دیا گیا کہ:

﴿اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (القصص:۵۶)

’’(اے نبیؐ!) آپ کو اختیار نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں ہدایت دے دیں‘ یہ تو اللہ ہی ہے جو ہدایت دے سکتا ہے جس کو چاہے!‘‘

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کا ایک ضابطہ بنایا ہوا ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہوتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ

سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:۶۹) ''اور جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے ہم انہیں اپنے راستے دکھا کر رہیں گے''۔ زبردستی وہ کسی کو ہدایت نہیں دیتا۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (القصص) ''یقیناً اللہ تعالیٰ ناانصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

اب رہا ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ کا باہمی ربط وتعلق' تو رسالت اصل میں اتمامِ حجت اور قطعِ عذر کے لیے ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' انسان بذاتہٖ (as such) مسئول ہے' جواب دہ ہے' ذمہ دار ہے ان استعدادات کی بنیاد پر جو اسے ودیعت کی گئی ہیں' جن سے مسلح کر کے اسے اس امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ لیکن رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ اس پر مزید اتمامِ حجت کر دیا جائے' حق کو واضح کر دیا جائے۔ انبیاء ورُسل فطرت کے براہین و دلائل سے اور کلامِ الٰہی کے نور سے لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں' اُجالے میں لائیں' حق کی راہ روشن اور اُجاگر کریں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اس لیے کہ ایک حجت علمی بھی ہوتی ہے۔ آپ نے ایک بات کو دلائل سے ثابت کر دیا تو حجت قائم ہوگئی۔ لیکن یہ حجت ان لوگوں پر قائم ہوئی جن کی علمی سطح بلند ہے' جو اس دلیل کی value پر' اس کی بنیاد پر سمجھ پائیں۔ اس کے بعد نوعِ انسانی کی ایک بڑی وسیع تعداد وہ ہوگی جو شاید اس علمی سطح پر بات کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن ان لوگوں کے سامنے اس کا کوئی عملی نتیجہ پیش کر دیا جائے تو وہ سمجھ سکیں گے' بات واضح ہو جائے گی۔

قرآنی اصطلاح ''شہادت'' کا اصل مفہوم

انبیائے کرام حق کی دعوت اپنے قول سے دیتے تھے اور اُس کا نمونہ اپنے عمل سے پیش کرتے تھے۔ اور یہ نمونہ انفرادی سطح پر بھی تھا اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اس دعوت اور اس کے عملی نمونے کے لیے قرآن مجید کی اصطلاح ''شہادت'' ہے۔ اس لفظ کو آپ ذرا اچھی طرح سمجھئے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ اللہ کے راستے میں جان قربان کر دینے کے مفہوم

میں بکثرت استعمال ہوتا ہے‘ لیکن قرآن مجید کی رُو سے ’’شہادت‘‘ کا لفظ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں پورے قرآن میں نہیں آیا۔ صرف سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ میں یہ معنی لینے کی گنجائش موجود ہے‘ جہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾. قرآن مجید میں اللہ کی راہ میں قتل ہونے کا مضمون بار بار آیا ہے‘ لیکن وہاں لفظ شہادت یا شہید نہیں آیا۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰـكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾

’’اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مُردہ نہ کہو‘ بلکہ وہ تو درحقیقت زندہ ہیں‘ مگر تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے۔‘‘

اسی بات کو سورۂ آل عمران میں پھر دہرایا گیا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾

’’اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مُردہ گمان مت کرو‘ بلکہ وہ تو درحقیقت زندہ ہیں‘ اپنے ربّ کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔‘‘

سورۂ آل عمران ہی میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾﴾

’’محمد (ﷺ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں‘ اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ اور اللہ شکر گزار بندوں کو بدلہ دے گا۔‘‘

یہاں بھی اسی قتل فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ سورۃ التوبۃ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں

فرمایا گیا: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۱) ''وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔'' دیکھ لیجیے' کہیں بھی لفظ شہید یا شہادت نہیں ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی ایک خواہش کا اظہار اس طرح ہوتا ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ))[1]

''میری بڑی ہی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کر دیا جائے' پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہاں چار مرتبہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کا اظہار کیا ہے' مگر لفظ شہید استعمال نہیں فرمایا۔ لفظ شہید جو قرآن میں آیا ہے وہ اس مضمون کی وضاحت کے لیے آیا ہے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے' یعنی خلق خدا پر اتمامِ حجت کر دینا' یہ ہے اصل شہادت۔ اللہ کی طرف سے گواہی دے دینا' حق کی گواہی' صداقت کی گواہی' توحید کی گواہی' رسالت کی گواہی' بعث بعد الموت کی گواہی' جزاء وسزا کی گواہی' جنت و دوزخ کی حقانیت کی گواہی۔ یہ وہ گواہی ہے جس کا دینے والا درحقیقت اللہ کا گواہ ہے اور یہ وہ گواہی ہے جس کے لیے اللہ کے رسول مبعوث ہوئے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ 'میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں''۔ یہ شہادت قول سے ہوئی۔ اور اگر اس کی شہادت آپ نے اپنی زندگی میں دے دی تو یہ عملی گواہی ہے' جو یقیناً ایک بڑا مشکل کام ہے' بقول اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة' وکتاب الجهاد' باب تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللّٰه۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا آسان اور اس کی گواہی عملاً دینا بہت مشکل ہے۔ حضرت بلال ؓ کا اور جرم کیا تھا؟ یہی گواہی کہ اَحدٌ اَحدٌ! ورنہ نہ تو چوری کی تھی نہ ڈاکہ ڈالا تھا۔ اسی گواہی کی پاداش میں اوندھے مُنہ سنگلاخ زمین پر جب کہ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہوتا تھا' انہیں گھسیٹا جاتا تھا' مگر وہ پھر بھی یہ پکارتے چلے جاتے تھے کہ اَحدٌ اَحدٌ۔ جب نبی اپنی دعوت سے' اپنے قول سے' اپنے عمل سے اللہ کی توحید و وحدانیت کی گواہی' آخرت کی گواہی' حق و صداقت کی گواہی' عدل و انصاف کی گواہی دے دیتا ہے تو گویا اُس نے نسلِ انسانی پر حجت قائم کر دی' اور اس کے لیے اب لفظِ شہادت کا اطلاق ہوتا ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلاً شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾﴾

''(اے مسلمانو!) ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف ایک رسول تم پر اپنا گواہ بنا کر' جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام)۔''

یہی لفظ شاہد سورۃ الاحزاب میں بھی آیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۵﴾﴾

''اے نبی! ہم نے بھیجا ہے آپ کو شاہد بنا کر' مبشر بنا کر' نذیر بنا کر اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر اُس کے حکم سے اور (ہدایت کا) ایک روشن چراغ بنا کر!''

ان تمام حیثیتوں میں مقدم اور اہم ترین لفظ شہادت ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں رسولوں کی بعثت اسی شہادت کے لیے ہے۔ اس کا ظہور قیامت میں ہوگا جب اُمتوں کی جواب دہی ہوگی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عدالتِ اُخروی میں ایک محاسبہ اجتماعی سطح پر ہوگا جب اُمتوں کے معاملات طے ہوں گے۔ اس کو آپ اجتماعی محاسبہ (collective accountability) کہہ لیجیے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آئے گا جب ہر ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَکُلُّھُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾﴾ (مریم)۔ جب محاسبہ اُمتوں کی سطح پر ہوگا اُس کا نقشہ قرآن حکیم میں

بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾ (النساء)

''(اے نبی!) پس کیسا ہوگا اُس دن (کیا ہوگا اُس دن' کیا بنے گی اُس دن) جبکہ ہم ہر ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف!''

گواہ کس معنی میں؟ کہ آپ نے ان پر اتمامِ حجت کر دیا ہے' اور روزِ محشر آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا دین' تیری ہدایت جو مجھ تک پہنچی تھی میں نے بلاکم و کاست ان کے سامنے پیش کر دی' اب یہ خود جواب دہ اور مسئول ہیں' اپنے طرزِ عمل کے پورے طور پر ذمہ دار ہیں' یہ لاعلمی کا بہانہ نہیں بنا سکتے۔ یہ گواہی اُمت کے خلاف پڑنے والی ہے۔ اس دَور کی مروّجہ اصطلاحات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء ورُسل سرکاری گواہ (prosecution witnesses) کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضور! آپ کو سناؤں؟ آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے! آپؐ نے فرمایا: ہاں! مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور لطف آتا ہے۔ امتثالِ امر میں انہوں نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ وہ نگاہیں نیچے کیے ہوئے پڑھ رہے تھے اور آنحضور ﷺ سن رہے تھے' جب اس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((حَسْبُكَ حَسْبُكَ)) (بس کرو' بس کرو) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے جو نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت

فلسفۂ رسالت کے اعتبار سے یہ مسئلہ بھی اہم ہے کہ رسول کے آنے کے بعد چونکہ حجت آخری درجے میں قائم ہو جاتی تھی' لہٰذا جس قوم کے پاس رسول بھیج دیا جاتا تھا

اب اُس کو کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے لیے رسول گویا آخری عدالت کا فیصلہ بن کر آتا تھا۔ جب تک رسول نہیں آیا قوم کے پاس کوئی عذر باقی ہے' لیکن رسول کے آنے کے بعد' ہدایت کے اس طرح مبرہن ہو جانے کے بعد' حق کے اس طرح منکشف ہو جانے کے بعد' قولاً اور عملاً حجت قائم ہو چکنے کے بعد اب بھی اگر کوئی قوم اپنے کفر اور اپنے انکار پر اَڑی ہوئی ہے تو اب وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیج دیا گیا اور اس کے باوجود وہ کفر پر' شرک پر' کجروی پر اَڑی رہی تو اس کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان کے انجام کو قرآن مجید کہیں یوں تعبیر کرتا ہے: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (ھود:۹۵) ''وہ ایسے ہو گئے گویا کبھی وہاں تھے ہی نہیں''۔ کہیں الفاظ آتے ہیں: ﴿لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسَاكِنُهُمْ﴾ (الاحقاف:۲۵) ''اب نہیں دکھائی دیتے مگر ان کے مسکن!'' مکین نہیں رہے' صرف مکان رہ گئے کھنڈرات کی شکل میں' جو اپنے رہنے والوں کی عبرت ناک داستان سنا رہے ہیں۔ قومِ نوحؑ پر' قومِ ہودؑ پر' قومِ صالحؑ پر' قومِ لوطؑ پر' قومِ شعیبؑ پر اور آلِ فرعون پر اللہ تعالیٰ کی اسی سنت اور اسی قانون کے تحت عذابِ استیصال آیا۔

یہ معاملہ ایک اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام بھی رسول تھے۔ قرآن مجید میں صاف لکھا ہے: ﴿رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾۔ مَیں نے ابتدا میں نبوت و رسالت کا جو فرق عرض کیا تھا اُس اعتبار سے نبی کے لیے یہ شرط لازم نہیں ہے کہ وہ ضرور غالب ہو کر رہے' نبی مغلوب بھی ہو سکتا ہے' قتل بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام قتل ہو گئے۔ جبکہ رسول کبھی مغلوب نہیں ہوتا' وہ تو اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک سی ایس پی اپنی جگہ جو کچھ بھی ہے' جب وہ کہیں ڈی سی کی حیثیت سے چارج لے لے گا تو اب اس کی عزت حکومت کی عزت ہو جائے گی' اُس کا وقار حکومت کا وقار ہو گا' کیونکہ اب وہ حکومت کا نمائندہ ہے۔ نبی' نبی ہونے کی حیثیت سے اپنا ایک رتبہ رکھتا ہے جو بہت بلند رتبہ ہے' لیکن اس کے معاملے میں اللہ کا وہ قانون نہیں ہے جو رسولوں کے معاملے میں ہے۔ بنی اسرائیل کے وہ جرائم جن کی پاداش میں ان پر ذلت و مسکنت

مسلط کی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہرے‘ ان میں انبیاء کا قتل بھی شامل ہے:
﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ (البقرۃ:۶۱)
’’یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے‘‘۔ لیکن رسولوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ ’’اللہ نے لکھ دیا ہے کہ مَیں اور میرے رسول لازماً غالب آ کر رہیں گے‘‘۔ چنانچہ رسول قتل نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہی تو فریاد کی تھی کہ: ﴿اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾﴾ (القمر) ’’اے اللہ! مَیں تو مغلوب ہوا چاہتا ہوں‘ پس تو مدد فرما!‘‘ پھر اللہ کی مدد آئی تو پوری قوم کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ایک اور مقام پر رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کا قانون وضابطہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّھُمْ لَھُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

’’اور گزر چکا ہے ہمارا یہ حکم ہمارے اُن بندوں کے بارے میں جنہیں ہم نے رسول بنا کر بھیجا‘ کہ یقیناً اُن کی مدد کی جائے گی‘ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا‘‘۔

چنانچہ رسولوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آتے ہیں تو قوم کے لیے عدالت بن کر آتے ہیں۔ قوم انکار کرتی ہے تو اس کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے اور رسول غالب رہتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ نہ مانا جائے کہ ان کو دوبارہ دنیا میں آنا ہے‘ جسے ’’عقیدۂ نزولِ مسیح‘‘ کہا جاتا ہے‘ تو یہ قانون ٹوٹتا ہے۔ وہ تو پھر مغلوب ہوئے اور جس قوم کی طرف انہیں بھیجا گیا وہ اپنے کفر کے باوجود نیست و نابود نہیں ہوئی۔ کفر بھی کیسا کفر کہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر کو انہوں نے کافر‘ مرتد اور جادوگر کہا‘ اور اپنی حد تک تو سولی پر چڑھا کر دم لیا‘ اور پھر بھی وہ قوم دنیا میں موجود ہے! اللہ کا یہ قانون اٹل ہے‘ درحقیقت اس کو ابھی پورا ہونا ہے۔ صرف یوں کہیے کہ وہ محفوظ فیصلہ (reserved

(judgement) ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں چند صدیوں کی مدت کوئی بڑی طویل مدت نہیں۔ وہ فیصلہ نافذ ہوگا اور یہودی اسی رسول کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوں گے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

یہ تو ہمارے ہاں ایک جھوٹی نبوت کے لیے راستہ ہموار کرنے کے لیے ایک شوشہ چھوڑا گیا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ کوئی مثیلِ مسیح نہیں، عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام خود آئیں گے، اور یہ قانون متقاضی ہے کہ اُنہی کے ہاتھوں یہودیوں کو سزا ملے۔ احادیث نبویؐ میں خود حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں یہودیوں کو ملنے والی سزا کی تصریح ملتی ہے اور ان یہودیوں کا جو آخری انجام ہے، جس کیفر کردار کو یہ دنیا میں پہنچیں گے اس کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ ہر وہ پتھر جس کے پیچھے کوئی یہودی چھپے گا وہ پکار کر کہے گا: ''اے روح اللہ! یہ یہودی ہے جو میرے پیچھے چھپا ہوا ہے'' اور حضرت مسیح مقامِ لُد پر دجال کو قتل کریں گے۔ یہ وہی لیڈا (Lydda) ہے جو اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ حدیث میں اس کے لیے لفظ ''لُد'' آیا ہے۔ دجالِ اکبر وہاں سے بھاگنے کی فکر میں ہوگا اور حضرت مسیحؑ اس کو مار دیں گے۔ بہرحال یہ ایک علمی مسئلہ تھا اور میں نے چاہا کہ نبوت و رسالت کی جو بحث آج آئی ہے اس کے حوالے سے اس کو بھی واضح کر دوں۔

رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت کا اتمام و تکمیل

اب لوٹیے اصل مضمون کی طرف! قافلۂ نبوت و رسالت چلتا رہا، اللہ کے رسول آتے رہے، قوموں پر حجت قائم کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے نزدیک تاریخ نبوت، تاریخ آدمیت ہے۔ چنانچہ قافلۂ انسانیت بھی چلتا رہا اور شعور و تمدن کی منزلیں طے کرتا رہا۔ یہ بات اگرچہ صد فیصد درست ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اس کا ایک اہم تر پہلو ہے، اور بدقسمتی سے اس کی طرف

توجہ نہیں کی جاتی ' کہ نبوت و رسالت کا نبی اکرم ﷺ پر صرف خاتمہ نہیں ہوا' بلکہ اتمام ہوا ہے' تکمیل ہوئی ہے۔ کسی شے کا مجرد ختم ہو جانا باعث فضیلت نہیں ہے۔ بلکہ اس پر تو منطقی طور پر اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے کہ ایک فضیلت تھی جس کو ختم کر دیا گیا' ایک سلسلۂ فیض تھا جو بند ہو گیا۔ اس لیے نبوت و رسالت کا معاملہ صرف ختم نہیں بلکہ اپنے اتمام اور اکمال کو پہنچنے کے بعد ختم ہوا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔''

یہ دونوں الفاظ (اِکمال اور اِتمام) قرآن مجید کے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے جو تشبیہ دی ہے وہ آپ کے علم میں ہو گی کہ میری ختم نبوت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بہت بڑا محل تعمیر کیا گیا' اس میں ایک جگہ کوئی رخنہ تھا' لوگ دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس عمارت میں یہ خلا کیوں چھوڑ دیا گیا؟ میرے آنے سے وہ خلا پُر ہو گیا اور قصر نبوت مکمل ہو گیا' رسالت کی عمارت اپنے تکمیلی مرحلے کو پہنچ گئی۔

نبوت و رسالت کے اتمام و تکمیل کے دو پہلو بڑے اہم ہیں۔ قافلۂ نبوت کے ساتھ چلتے چلتے قافلۂ انسانیت نے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے نکل کر عہدِ بلوغت میں قدم رکھا۔ ایک طرف عقلی و فکری اعتبار سے۔ انبیاء کا معاملہ ایک طرف رکھئے' ان کو اللہ تعالیٰ جو شعور یعنی شعورِ نبوت عطا کرتا ہے وہ ایک استثنائی (exceptional) چیز ہے۔ شعورِ نبوت وہبی ہے' کسبی نہیں ہے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو پورا شعور عطا کیا گیا تو اس میں کوئی تعجب والی بات نہیں ہے۔ یہ اس قاعدۂ کلیہ سے صرف ایک استثنائی صورت ہے۔ بحیثیت مجموعی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسل انسانی نے عقلی بلوغ کے لیے منزلیں طے کی ہیں۔ دوسری طرف انسان نے اجتماعیت اور تمدن کا سفر طے کیا ہے' مل جل کر رہنے کا نظام بنایا ہے اور اس کے بھی تدریجی مراحل ہیں۔ سوچ' فکر' عقل کا بھی ارتقائی سفر ہے اور اجتماعیت' تہذیب اور تمدن کا بھی ایک سفر ہے جو قافلۂ انسانی

طے کر رہا ہے۔ آج سے چودہ سو برس قبل وہ وقت آیا کہ محمد عربی ﷺ کی بعثت ہوئی۔ایک سوال یہاں پیدا ہوسکتا ہے ـــــ اور آپ کو معلوم ہے کہ سوال پیدا ہوتے ہیں تو علم آگے بڑھتا ہے۔سوچ تب ترقی کرتی ہے جب سوال سامنے آتا ہے۔کوئی سوال ہی نہ ہو تو فہم میں' قوتِ نظری اور قوتِ فکری میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔وہ سوال یہ ہے کہ کیا سبب ہے کہ یہی وقت منتخب کیا گیا آخری اور کامل نبوت و رسالت کے لیے؟ آج سے چودہ سو برس قبل کا وقت کیوں مقرر کیا گیا؟ ایک ہزار سال پہلے یا ایک ہزار سال بعد کا کیوں نہیں؟ اللہ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں' **فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ.** سوال سامنے رکھئے اور جواب تلاش کیجیے! شاید حکمت خداوندی سے کچھ حصہ میسر آ جائے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا مذاہب وفلسفہ دونوں کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اچانک میرے سامنے ایک بڑی اہم بات بیان کی اور مَیں نے ان کو توجہ دلائی کہ اس بات کا تعلق براہِ راست ختم نبوت سے ہے۔انہوں نے کہا کہ تاریخ اسلامی کے بارہ تیرہ سو سال اس اعتبار سے بڑے اہم ہیں کہ انسان نے حقیقتِ نفس الامری تک رسائی کے لیے جو بھی سعی وکوشش کی ہے' سوچا ہے' غور وفکر کیا ہے' اسی عرصے میں کیا ہے' جس کے نتیجے میں مذاہب پیدا ہوئے' مکاتبِ فلسفہ وجود میں آئے۔یہ ۶۰۰ یا ۷۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ بعد مسیح تک کا زمانہ ہے' جب یونان' ہندوستان' چین اور ایران میں غور وفکر جاری رہا ہے۔ویسے تو انسانی تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مصر کا بھی ایک مقام ہے' لیکن جسے واقعتاً سوچ اور فکر کا نام دیا جا سکے' اُس کے دنیا میں یہ چار ہی مراکز ہیں۔یعنی یونان' ایران' ہندوستان اور چین۔یہیں مذاہب پیدا ہوئے' فلسفے پیدا ہوئے۔چشتی صاحب کا کہنا ہے کہ ان بارہ تیرہ سو برس میں ہر اعتبار سے انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا اُس نے سوچ لیا اور اس کے بعد کوئی نیا زاویۂ نگاہ' کوئی نیا فکر بالکل وجود میں نہیں آیا۔یہ جو یورپ کی جدید فلاسفی ہے یہ قدیم افکار ونظریات کی صرف صدائے بازگشت ہے۔وہی پرانے فلسفے اور وہی نظریات ہیں' ان کو انسان دوبارہ

کھنگال رہا ہے اور انہیں نئے لیبلوں کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ فلسفہ مکمل ہو چکا تھا جبکہ محمدؐ عربی ﷺ تشریف لائے۔ گویا اب وہ وقت آ چکا تھا کہ انسان کو وہ آخری ہدایت نامہ دے دیا جائے' کیونکہ وہ سب کچھ سوچ چکا تھا' انسان میں جس قدر بھی صلاحیت بحیثیت انسان تھی وہ بروئے کار آ چکی تھی۔ اب اس کے فکر و عمل کے لیے آخری اور کامل ہدایت نامہ عطا کر دیا گیا۔

ایک دوسرے پہلو سے بھی نوعِ انسانی نے اجتماعیت کی طرف سفر کی متعدد منزلیں طے کر لی تھیں۔ انسان کبھی قبیلوں کی شکل میں رہتا تھا۔ اُس دور کو چھوڑیے جب ابھی قبیلوں کی شکل بھی نہ تھی۔ اجتماعیت کا نقطۂ آغاز قبائلی نظام (Tribal System) ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں اب تک وہ نظام موجود ہے اور ہمارے زیرِ انتظام اب تک وہ علاقے ہیں جہاں سب سے بڑا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کا نظام ابھی تک اسی قبائلی نظام کے تحت قائم ہے۔ یہ انسانی اجتماعیت کی سب سے ابتدائی صورت ہے۔ قبیلہ ایک مکمل سیاسی یونٹ بھی ہے' مکمل معاشرتی یونٹ بھی ہے اور ایک معاشی یونٹ بھی ہے۔ گویا کُل اجتماعیت انسانیہ نے ایک قبیلہ کی شکل اور ہیئت اختیار کر لی ہے۔ اس سے آگے چلیے! کچھ قبیلوں نے مل جل کر ایک شہر میں رہنا شروع کیا تو شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ قبیلے کی سطح پر زندگی بسر کر رہا تھا' جہاں صرف ایک قبیلہ آباد تھا۔ مدینہ منورہ اس سے اگلے قدم پر تھا' یہ ایک شہری ریاست تھی۔ وہاں پانچ قبیلے آباد تھے اور ان کے آپس کے معاملات طے کرنے کے لیے اصول معین تھے۔ یوں کہہ لیجیے کہ ابتدائی صورت میں ایک دستور موجود تھا' چاہے وہ لکھا ہوا نہ ہو۔ تحریر شدہ دساتیر تو اب بھی دنیا کی کئی بڑی بڑی مملکتوں کے ہاں بھی نہیں ہیں۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی دنیا میں دو عظیم مملکتیں قائم تھیں' یعنی سلطنتِ فارس اور سلطنت روما۔ یہ گویا آپس میں جھولا جھولتی رہتی تھیں۔ کبھی ایک کو عروج حاصل ہوتا تو کبھی دوسری کو۔ مغربی ایشیا' شام' فلسطین اور ترکی کا علاقہ کبھی اِدھر

ہوتا تھا تو کبھی اُدھر۔ سورۃ الروم کے آغاز میں سلطنت روما کے مغلوب ہو جانے کے بعد دوبارہ غلبے کی پیشین گوئی کی گئی: ﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝﴾ ان کے درمیان یہ معاملہ رہتا تھا کہ کبھی یہ آگے بڑھے تو وہ پیچھے ہٹ گئے، کبھی وہ آگے بڑھے تو یہ پیچھے ہٹ گئے۔ یہ دو عظیم مملکتیں، دو عظیم سلطنتیں کئی سو برس تک دنیا میں قائم رہیں۔ یہاں بھی اجتماعیت انسانی نے وہاں تک سفر طے کر لیا تھا۔ اس کے بعد انسانیت نے صرف ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور یہ ہے تصورِ ریاست (concept of state)۔ اسے قبائلی نظام سے ایک قدم آگے کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جب آنحضورﷺ کی بعثت ہوئی اُس وقت تہذیب وتمدن اور اجتماعیتِ انسانیہ اس سطح پر پہنچ چکے تھے کہ گویا ایک جدید دَور کا آغاز ہونے والا تھا، جبکہ اجتماعیت کی گرفت انسان کی زندگی پر فیصلہ کن ہو چکی تھی۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت لے چکی تھی۔ اُس وقت بعثت ہوئی حضرت محمدؐ رسول اللہﷺ کی، تاکہ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہو سکے۔

منصبِ رسالت کا اصلی بنیادی مقصد وہی شہادت علی الناس ہے، جس کے لیے تمام رسول مبعوث ہوئے۔ بنیادی طور پر محمدؐ رسول اللہ کا مقصد بعثت بھی وہی ہے، لیکن اس کی جہات (dimensions) بدل رہی ہیں۔ کیونکہ انسان عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر بلوغت اور پختگی کی عمر میں قدم رکھ چکا ہے۔ قافلۂ انسانیت ابتدائی منزلیں طے کر کے اب اس دورِ جدید میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس وقت محمدؐ رسول اللہﷺ کی بعثت ہوئی اتمامِ رسالت، تکمیل نبوت اور ختمِ نبوت کے ساتھ۔ اس اتمامِ رسالت، تکمیل نبوت اور ختم نبوت کے لوازم پر اِن شاء اللہ تعالیٰ آئندہ نشست میں گفتگو ہو گی۔ مزید یہ کہ اس سطح پر اتمامِ حجت کے لیے نبی اکرمﷺ نے جس طرح محنت اور جدوجہد کی اور اس نظامِ اجتماعی کا نقشہ پیش کیا اور پھر اس نظامِ اجتماعی کے نقشے کو عملاً قائم کر کے نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے اتمامِ حجت کر دیا، یہ سب کچھ اِن شاء اللہ میری آئندہ کی گفتگو کا موضوع ہو گا۔ oo

اقولی قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

حسنِ معاشرت

عفو و درگزر کی ضرورت و اہمیت
سیرتِ طیّبہ کے آئینے میں

تحریر: پروفیسر حافظ محمد ایوب

بعض کام آدمی جلد بازی میں کر گزرتا ہے اور ان کے نتائج پر اُس کی نگاہ نہیں ہوتی' حالانکہ انجام کے اعتبار سے وہ انتہائی خطرناک اور مہلک ہوتے ہیں۔ بات اکثر اوقات معمولی ہوتی ہے مگر غصے یا بے سمجھی میں اٹھایا ہوا قدم قتل و غارت تک پہنچ جاتا ہے۔ ٹریفک کے اشارے کو نظر انداز کرنے سے کئی دفعہ قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ لین دین کے معاملے میں معمولی سی رقم پر آپے سے باہر ہو کر کبھی لڑائی جھگڑا بڑے نقصان کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک معاملہ بڑی آسانی سے بات چیت کے ذریعے حل ہو سکتا ہے' لیکن ایسے موقع پر اگر فریقین مغلوب الغضب ہو کر کوئی فوری قدم اٹھالیں تو بات تھانے اور کچہری تک پہنچ جاتی ہے جہاں رقم بھی خرچ ہوتی ہے اور عزت بھی برباد ہوتی ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ ''پہلے تولو پھر بولو'' اور یہ کہ ع

چرا کارے کند عاقل باز آید پشیمانی؟

(عقل مند وہ کام کیوں کرے گا جس سے بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑے؟)

۳۱۔ مارچ ۱۹۹۸ء کے روزنامہ جنگ کے صفحہ ۱۶ پر درج خبر پڑھیے اور دیکھئے کہ طیش میں انجام سے بے خبر جلد بازی میں اٹھایا جانے والا قدم کس قدر ہلاکت آفریں ثابت ہوا۔ حیرت ناک مگر سبق آموز خبر کی سرخیاں درج ذیل ہیں:

''گدھا مسجد میں داخل ہونے پر دو افغان قبائل میں لڑائی.....۵۱ ہلاک''

''ایک شخص نے گدھے کو گولی مار کر ڈھیر کر دیا۔ مالک نے مشتعل ہو کر ۱۳ نمازی ہلاک کر دیے''

''مقامی لوگوں نے گدھے کے مالک کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ راکٹ لانچروں اور

میزائلوں کا استعمال‘‘

مندرجہ بالا واقعہ کیا یہیں ختم ہو جاتا ہے یا یہ جنگ کتنی اور جانوں کو تلف کرے گی اور کتنا عرصہ خون کی ندیاں بہتی رہیں گی‘ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کی تربیت اسی انداز میں کرتا ہے؟ یہ کردار تو عرب کی جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کے کردار سے بھی بدتر ہے جن کے پاس نورِ اسلام کی کوئی کرن نہیں پہنچی تھی۔ مولانا حالی عفو و درگزر سے عاری اُس قوم کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں جن کی باہمی جنگیں تقریباً آدھی صدی پر محیط تھیں اور جن کے نتیجے میں قبیلوں کے قبیلے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ؎

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جُو کبھی آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں!

اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ایسی اخلاقی اقدار کا خوگر بن جائے جو اسلام کا شعار ہیں اور جن کے بغیر اسلام کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (۱)

’’مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں‘‘۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ نہ ہوں تو اس کے مسلمان ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات جنم لے سکتے ہیں۔

حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قِيْلَ وَمَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟قَالَ: ((اَلَّذِىْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَايِقَهٗ))(۲)

’’اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں‘ اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں‘ اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں‘‘۔ پوچھا گیا: کون ہے وہ اے اللہ کے رسولؐ؟ آپؐ نے فرمایا: ’’وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے امن میں نہیں ہے‘‘۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَّا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)) (۳)

''ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں''۔

اس حدیث میں اگرچہ بعض مخصوص حالات میں مؤمن نہ ہونے کی نشاندہی فرمائی گئی ہے لیکن مجموعی طور پر یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچانا اسلام میں سخت ناپسندیدہ فعل ہے۔ ایسا کرنے والا شخص اسلامی معاشرے میں اپنی قدر و قیمت اور احترام سے محروم ہو جاتا ہے' ہر چھوٹے بڑے کی نظروں میں حقارت کے سوا اسے کچھ نہیں ملتا۔ لوگ اس کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لیے صرف وقتی طور پر اسے قدرے عزت دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف فرما تھے اور کسی شخص نے اجازت طلب کی۔ رسول اکرم ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا: ((بِئْسَ اَخُو الْعَشِیْرَةِ)) ''قبیلے کا بدترین انسان ہے''۔ جب وہ شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گیا تو آپؐ نے نہایت نرمی سے بات کی۔ اس کے جانے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے استفسار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص بہت برا ہے جس کے شر سے بچنے کے لیے اس کو چھوڑ دیا جائے''۔(٤)

رسول اللہ ﷺ کو یہ بات گوارا ہی نہیں کہ کسی مسلمان کو تکلیف دی جائے۔ آپ ﷺ نے اس بارے میں یہاں تک فرمایا ہے:

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ)) (٥)

''مسلمان کو گالی دینا فاسق بنا دیتا ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر کرنے کے مترادف ہے۔''

بالفرض کوئی شخص ایسے لوگوں میں نہیں ہے جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں' لیکن اس سے نادانستہ طور پر کوئی ایسی غلطی ہو جائے جو دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے تو ایسا شخص اگر اپنے فعل پر نادم ہو' اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور دوبارہ ایسا نہ کرنے کا عزم کرے' تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو معاف فرما دیتے ہیں۔ جیسے کہ حدیث میں ہے:

((فَاِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اعْتَرَفَ ثُمَّ تَابَ' تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) (٦)

''تو جس شخص نے (غلطی ہو جانے کے بعد) اعتراف کر لیا اور توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔''

اگر ایسی غلطی سے کوئی انسان یا معاشرہ متأثر ہوا ہے تو متعلقہ لوگوں سے معذرت کی

جائے گی۔ اسلام انہیں بھی اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لیں اور ایسے شخص کی معذرت قبول فرمالیں اور اسے اصلاح کا موقع دیں۔ اللہ ربّ العزت کا یہی قانون ہے۔ کیونکہ اگر فوری طور پر سزا دینے کا عمل اختیار کر لیا جائے تو زمین پر کوئی بھی زندہ نظر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰـكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ (النحل)

''اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اُن کا مؤاخذہ فرماتے تو زمین پر کوئی جانور بھی نہ چھوڑتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ایک محدود مدت تک مہلت دیتا ہے اور پھر جب ان کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو پھر لمحہ بھر کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ''عفو'' کا ذکر قرآن پاک میں کئی مقامات پر فرمایا ہے۔ سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٥٨﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ﴾ (الحج)

''جو لوگ کفار کی سختیوں سے تنگ آنے کے بعد اللہ کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ آئے' پھر یا تو وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑتے ہوئے شہادت پا گئے یا طبعی موت مر گئے' اللہ تعالیٰ لازماً انہیں بہت عمدہ رزق عطا فرمائے گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے' اور لازماً انہیں پُرکشش جگہ میں داخل فرمائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا تحمل والا ہے۔''

اس ذکرِ خیر کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِىَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿٦٠﴾﴾

''بات یہی ہے' اور اگر کوئی شخص اپنے دشمن کو اتنا تنگ کرے جتنا وہ خود دشمن سے تنگ ہوا تھا اور پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس مظلوم کی دادرسی فرمائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے''۔

اسی طرح سورۃ المجادلۃ کی ابتدائی آیات میں بیویوں کے متعلق ''ماں'' کے لفظ استعمال کر کے انہیں اپنے لیے حرام کر لینے والے شوہروں کی بات کو اللہ تعالیٰ نے بہت ہی ناپسند فرمایا اور ان کے اس عمل کو منکر و زُور (بے ہودہ اور جھوٹ کا پلندہ) قرار دیا ہے' لیکن انہیں اپنی رحمت سے مایوس نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنی صفات ''عفو'' اور ''غفور'' کا ذکر کر کے انہیں اصلاح کا موقع دیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی دعوتِ ہدایت اور کفار کے مسلسل انکار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۱۹۸ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝۱۹۹﴾

''اگر آپ انہیں ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ لوگ آپ کی بات نہیں سنتے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ پھٹی ہوئی نظروں سے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں' حالانکہ ان میں دیکھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ ان سے درگزر فرمائیں' نیکی کا حکم دیتے رہیں (بھلائی کا کام جاری رکھیں) اور جاہلوں کو مُنہ نہ لگائیں۔''

یہ آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو تبلیغ دین کے سلسلے میں پیش آنے والے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی تلقین فرماتا ہے اور تکلیف دینے والوں کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آنے کی ہدایت فرماتا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی الجھنا چاہے تو بھی جھگڑنے سے باز رہنے کی تلقین فرماتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عفو و درگزر کے معاملے کو کمال تک پہنچایا اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے ایسی مثالیں چھوڑ گئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کی اذیتیں دینے والے دشمنوں کو آپ ﷺ نے نہ صرف معاف فرمایا بلکہ ان کو گلے لگایا' ان کے احترام میں کوئی کمی نہ فرمائی۔

دشمنوں سے عفو و درگزر

دشمن سے انتقام لینا اور خاص طور پر دشمن بھی ایسا جس نے بھرپور دشمنی کی ہو' لہو کا پیاسا' ساری زندگی دکھ دینے والا' ہر دم گھات میں رہنے والا' اس کے لگائے ہوئے زخم مسلسل رِس رہے ہوں' ساری زندگی چین سے نہ بیٹھنے دیا ہو' ایسے آدمی سے انتقام لینا ایک فطری تقاضا ہے۔ لیکن ایسے دشمن کو اُس وقت معاف کرنا اور درگزر کرنا' بدلہ نہ لینا جبکہ بدلہ لینے کی پوری طاقت بھی ہو اور حالات بھی سازگار ہوں' کتنی بڑی عظمت کی بات ہے۔ رسول

اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ)) (۷)

''طاقتور وہ نہیں جو مدمقابل کو پچھاڑ دے' بلکہ طاقتور وہ ہوتا ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔''

قرآن مجید میں مؤمنوں کی صفات کا تذکرہ فرماتے ہوئے اللہ ربّ العالمین نے ان کی چند صفات کی نشاندہی کی :﴿وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۳۴) ''اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے''۔ وہ غصہ کو پی لیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ رسول رحمت ﷺ اس آیت کی مجسم تفسیر تھے۔ طعنے دینے والوں' مجنوں اور جادوگر کہنے والوں' راہ چلتے ہوئے اوپر سے سر مبارک میں گندگی پھینکنے والوں بلکہ خون کے پیاسوں کو جس طرح عفو و درگزر سے نوازا' وہ آپؐ کی ہستی کا ہی خاصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ایسے چند واقعات پیش خدمت ہیں:

☆ سردارانِ قریش کو معاف کرنا:

فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ میں داخل ہونے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے اذان دینے کا حکم دیا۔ سردارانِ قریش میں سے ابوسفیان' عتاب و خالد بن اُسید' حارث بن ہشام وغیرہ بیت اللہ کے صحن میں موجود تھے۔ عتاب اور خالد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے والد کی بڑی عزت رکھی کہ وہ اس اذان کو سننے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حارث نے کہا خدا کی قسم! اگر مجھے یقین ہو جائے کہ آپ ﷺ حق پر ہیں تو میں آپ کی اطاعت میں آ جاؤں گا۔ ابوسفیان نے کہا کہ میں خاموشی اختیار کرتا ہوں اور اپنی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالنا چاہتا' کیونکہ میرے مُنہ سے نکلی ہوئی بات کے متعلق یہ سنگریزے بھی آپ (ﷺ) کو باخبر کر دیں گے۔ اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ ادھر سے گزرے تو آپؐ نے ان سرداروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہاری گفتگو کے بارے میں مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ آپؐ نے ان کی ساری گفتگو کو دہرا دیا۔ حارث اور عتاب نے فوراً آپؐ کی رسالت کا اقرار کر لیا۔ مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عتابؓ کو مکہ کا والی مقرر کر دیا۔ (۸)

☆ ہبار بن اَسود کے لیے معافی:

اس شخص نے قبولِ اسلام سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ

انتہائی گستاخانہ رویہ اور بدسلوکی کا مظاہرہ کر کے آپؐ کو دلی دکھ پہنچایا تھا۔ اولاد کی تکلیف والدین کے لیے نہایت ہی باعثِ اذیت ہوا کرتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس طرزِ عمل کی وجہ سے اس کا خون مباح ہونے کے باوجود اس کا اسلام لانا قبول فرمایا اور اسے معاف کر دیا۔ واقعہ کی حقیقت مؤرخین نے یوں بیان کی ہے:

''ہجرت کے ابتدائی ایام میں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا زوجہ ابوالعاص بن ربیع مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہی تھیں۔ ہبار بن اَسود نے چند اوباشوں کے ساتھ مل کر ان کا راستہ روکا اور انہیں ایک نیزہ مارا جس سے وہ سواری سے گر پڑیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپؓ ان دنوں حاملہ تھیں۔ آپ کے گرنے سے حمل ساقط ہو گیا اور یہی واقعہ آپؓ کی موت کا سبب بنا۔ لیکن جب یہ شخص فتح مکہ کے دن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ ہبار بن اَسود ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں نے اسے دیکھ لیا ہے''۔ کسی نے بڑھ کر اسے مارنا چاہا تو رحمت عالم ﷺ نے روک دیا۔ ہبار نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا اور آپؐ نے اسے معاف فرما دیا۔''(۹)

☆ وحشی بن حرب کے لیے معافی:

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جو تعلق آقائے نامدار ﷺ کے ساتھ تھا وہ کسی مسلمان سے ڈھکا چھپا نہیں۔ وہ آپؐ پر جان نچھاور کرتے تھے۔ غزوۂ اُحد میں وحشی نے گھات لگا کر آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اس کا خون مباح قرار دے دیا تھا' اس لیے یہ شخص بھاگ کر پہلے طائف چلا گیا اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور آپؐ سے اپنے قصور کی معافی چاہی۔ رحمت للّعالمین ﷺ نے اسے دامنِ رحمت میں جگہ دی اور معاف کر دیا۔ انسانی تاریخ عفو و درگزر کی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اپنی محبوب ہستیوں کے قاتلوں کو صرف اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دینا نبیٔ رحمت ﷺ ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے' ورنہ ایسی حالت میں عربوں کے ہاں تو صدیوں قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا۔(۱۰)

☆ ابومحذورہ کو معاف کرنا:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے دن جب بیت اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو ابومحذورہ جمحی اور چند دوسرے نوجوانوں نے ان کی اذان کا مذاق اڑایا اور اذان کی نقل

اتاری۔ ابومحذورہ کی آواز بہت بلند اور سریلی تھی۔ جیسے ہی رسول اللہ ﷺ نے اس کی آواز سنی تو ان سب کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ دریافت فرمایا کہ تم میں سے کون شخص ہے جس کی آواز میں نے سنی ہے۔ سب جوانوں نے ابومحذورہ کی طرف اشارہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے روک لیا اور باقی جوانوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ ابومحذورہ آپ ﷺ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ ابومحذورہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ابومحذورہ! اذان دو۔ چنانچہ میں نے بادلِ نخواستہ اذان دی۔ اذان سننے کے بعد آپؐ نے مجھے ایک تھیلی عطا فرمائی جس میں چند درہم تھے۔ اس کے بعد میرے سر، پیشانی، سینہ اور پیٹ پر ناف تک دست مبارک پھیرا اور زبان مبارک سے میرے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ ابومحذورہ بیان کرتے ہیں کہ دستِ مبارک کا پھیرنا تھا کہ میرا دل آپ ﷺ کے خلاف نفرت کی بجائے محبت و الفت سے لبریز ہو گیا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے مکہ کا مؤذن مقرر فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ کو مؤذن مقرر کیا جاتا ہے۔ میں نے امیر مکہ عتاب بن اُسید کو اس بات کی اطلاع دی اور آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق اذان دینا شروع کر دی اور پوری زندگی اس ذمہ داری کو نبھایا۔ (۱۱)

ایسی حالت میں جبکہ کوئی شخص کسی شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو، مفتوح قوم کے لوگ غلاموں کی طرح سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں، ان میں سے پھر کوئی آدمی فاتحین کی مرضی کے خلاف بات کرے، ان کی خواہشات کا احترام نہ کرے، بلکہ عین اُس وقت جبکہ انتقامی جذبات عروج پر ہوں، ایسی حرکات کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ لیکن ایسے حالات میں صرف اللہ کی رضا کے لیے انتقامی جذبات کے طوفان کو قابو میں لانا اور دشمنی کو محبت و شفقت کے دامن میں لپیٹ کر دشمن کو سینے سے لگا لینا حبیبِ ربّ العالمین ﷺ ہی کی صفات کا حصہ ہے۔

☆ ہند بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان کے لیے معافی:

عورتوں کی دشمنی اور انتقام دنیا میں ضرب المثل ہے۔ ابوسفیان کی زوجہ ہند دشمنی کی آگ میں اس قدر جل رہی تھی کہ اُس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کروایا اور شہادت کے بعد آپؓ کا سینہ مبارک چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا اور اس طرح اپنے سینے کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اس قدر دشمنی اور کدورت کا مظاہرہ کرنے والا انسان بھی کیا معافی کا مستحق ہو سکتا ہے؟ لیکن چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ رسول اکرم ﷺ کی بے پایاں رحمت سے ایسے

لوگ بھی فیض یاب ہوئے۔ آپؐ نے اسے بھی شرفِ بیعت سے نوازا۔ ہند کی بیعت کا واقعہ مؤرخین نے اس طرح نقل کیا ہے:

''ہند جب بیعت کے لیے حاضر خدمت ہوئی تو چہرہ نقاب سے چھپایا ہوا تھا۔ دشمنی کی ندامت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس شرمندگی کو پردے کی اوٹ میں چھپا کر پیکرِ عفو ودرگزر رحمتِ عالم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتی ہے' بیعت کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ رحمت للّعالمین ﷺ اگر ایسی سخت دشمن کو حاضری کی اجازت نہ دیتے تو اسلام یا مسلمانوں کو کیا فرق پڑتا! اسلام کی سربلندی اور ترقی کے لیے ہند کا مسلمان ہونا کوئی ضروری تو نہ تھا' جبکہ ہزاروں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے۔ لیکن اُس وقت بھی گفتگو میں شوخی اور مکالمہ بازی کا عنصر غالب نظر آتا ہے.....

ہند: یارسول اللہ ﷺ! آپ ہم سے کن باتوں پر عہد لیتے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ: تم کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراؤ گی۔

ہند: یارسول اللہ ﷺ! آپ ہم سے ان باتوں کا عہد لیتے جن کا عہد آپ نے مَردوں سے نہیں لیا۔

رسول اللہ ﷺ: تم کبھی چوری نہ کرو گی۔

ہند: میں تو اپنے خاوند (ابوسفیان) کے مال میں سے لے لیا کرتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں اسے آپ چوری سمجھتے ہیں یا نہیں۔ ابوسفیان بھی اس محفل میں موجود تھے اور مسلمان ہو چکے تھے۔ بولے جو کچھ گزر چکا' وہ معاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت اپنے خاوند کے مال میں سے اتنا لے سکتی ہے جس سے اس کی اولاد اور گھر کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور بدکاری نہ کرنا۔

ہند: کیا کوئی آزاد خودمختار عورت بھی زنا کرتی ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہند: رَبَّيْنَاهُمْ صِغَارًا وَقَتَلْتَهُمْ يَوْمَ بَدْرٍ كِبَارًا' اَنْتَ وَهُمْ اَعْلَمُ (بچپن میں ہم نے انہیں پالا پوسا اور جب وہ بڑے ہوئے تو آپ نے انہیں جنگ بدر میں قتل کر دیا۔ اب معاملہ ان کا اور آپ کا ہے)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس موجود تھے۔ یہ بات سن کر ہنس پڑے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی پر بہتان نہ لگانا۔

ہند: اللہ کی قسم! کسی پر بہتان باندھنا تو بہت قبیح بات ہے۔ واقعی آپؐ حسن اخلاق اور نیکی کے سوا کسی بات کا حکم نہیں دیتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی نیکی کے کام میں نافرمانی اور انکار سے کام نہ لینا۔

ہند! ہم یہاں آپ کی محفل میں نافرمانی اور انکار کا ارادہ لے کر نہیں آئیں!''(۱۲)

آپ اندازہ کیجیے کہ زیردست آدمی معاہدہ کے وقت اگر اس طرح کا انداز اختیار کرتا ہے تو فاتح اس طرح کی شوخیاں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اسے اپنی ہتک اور برتری (supremacy) کے منافی خیال کرتے ہوئے مدمقابل کو جھڑک اور ڈانٹ سکتا ہے تاکہ اس کی برتری کی ہیبت اور شان قائم رہے۔ لیکن رسولِ رحمت ﷺ اس کی تمام شوخیوں اور مکالمہ بازیوں کو شانِ عفو میں ڈبو دیتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ ان سے بیعت لے لو۔ بیعت کے بعد آپؐ ان کے لیے دعا فرماتے ہیں۔ (۱۳)

☆عمیر بن وہب کے لیے معافی کا اعلان:

قریش مکہ کے اُکسانے پر عمیر بن وہب رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے مدینہ پہنچا۔ موقع کی تلاش میں تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا۔ اس کی تلوار چھین کر قابو میں کر لیا اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس لے آئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ پھر آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ''مدینہ کیسے آنا ہوا؟'' اس نے جواب دیا کہ میرا ایک بیٹا آپؐ کی قید میں ہے' اس کی خیریت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تلوار دیکھ کر فرمایا: ''تلوار کو گلے میں لٹکانے کا کیا مطلب ہے؟'' عمیر نے کہا کہ میں جلدی میں اسے گھر رکھنا بھول گیا تھا۔ آپؐ نے اس کی گفتگو سننے کے بعد فرمایا: ''عمیر! تم صفوان بن اُمیہ کے ساتھ ایک حجرے میں بیٹھ کر میرے قتل کے منصوبے بناتے رہے ہو اور صفوان نے اس کے بدلے تمہارا سارا قرض معاف کرنے کا وعدہ کیا ہے اور آئندہ کے لیے تمہارے گھر والوں کا خرچہ بھی اپنے ذمہ لے لیا ہے''۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ عمیر یہ سب کچھ سن کر بہت پریشان ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس سارے واقعہ کی اطلاع کیسے پہنچی! آخر کار اس نے اس سازش کا اعتراف کیا اور کہنے لگا: اے محمد ﷺ! آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور فرمایا: ''ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔ صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ''اپنے بھائی کو قرآن سکھاؤ اور اس کے قیدی بیٹے کو آزاد کر دو''۔ (۱۴)

☆ مکہ والوں کے لیے اناج کی بحالی:

کسی دشمن ملک یا حکومت کی مخالفت میں بے شمار حربے استعمال کیے جاتے ہیں' تاکہ انہیں پریشانیوں میں مبتلا کیا جائے اور مشکلات پیدا کی جائیں۔ یہ حربے سیاسی بھی ہوتے ہیں اور معاشی بھی' تاکہ کسی ملک کو کمزور کر کے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے اور اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ مکہ والوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بنی ہاشم کو تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رکھا۔ کھانے پینے سے محروم کر دیا۔ بھوک اور پیاس سے بڑے چھوٹے درختوں کے پتے اور سوکھے چمڑے وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے۔ جن لوگوں نے یہ حرکتیں کیں انہیں کیا پتہ تھا کہ جس رحمت عالم ﷺ کو آج ہم یہ تکلیف دے کر خوش ہو رہے ہیں ہمیں اسی کے دروازے پر بھیک مانگنے کی نوبت آئے گی۔ واقعہ اس طرح ہوا:

''ثمامہ بن اثالؓ تین دن تک مسلمانوں کی قید میں رہنے کے بعد آپ ﷺ کے حسن سلوک سے اتنے متاثر ہوئے کہ آزادی ملتے ہی اسلام لے آئے اور آپؐ سے عمرہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ جب مکہ پہنچے تو قریش مکہ نے بے دین ہونے کا طعنہ دیا کہ اے ثمامہ! تم نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ دیا ہے۔ قریش کے ان طعنوں سے متاثر ہوئے بغیر حضرت ثمامہؓ نے سرعام فرمایا کہ میں نے اُس دین کی اتباع کی ہے جو سب سے بہتر ہے اور جو دین محمدیؐ ہے۔ اے اہل مکہ! رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر اب تمہارے پاس یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی نہیں آئے گا۔ یمامہ پہنچ کر آپؓ نے قبیلہ کو حکم دیا کہ مکہ والوں کو غلہ قطعاً مہیا نہ کیا جائے۔ اہل مکہ نے اس واقعہ کی اطلاع نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی اور لکھا کہ: ''اِنَّکَ تَاْمُرُ بِصِلَةِ الرَّحِمِ وَاِنَّکَ قَدْ قَطَّعْتَ اَرْحَامَنَا وَقَدْ قَتَلْتَ آبَاءَ نَا بِالسَّيْفِ وَاَبْنَاءَ نَا بِالْجُوْعِ' (آپ صلہ رحمی کا پرچار کرتے ہیں' حالانکہ آپ نے ہماری رشتہ داری کو ختم کر دیا ہے' ہمارے آباء واجداد کو تلوار سے قتل کیا اور ہماری اولادوں کو بھوک کے ذریعے مارنے کا منصوبہ بنایا) یہ خط پڑھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے ثمامہ کو لکھا کہ وہ مکہ میں غلہ لے جانے کی اجازت دے دیں۔''(۱۵)

☆ مالک بن عوف پر نظر کرم:

ہوازن اور ثقیف کے قبائل جو حنین کے مقام پر آباد تھے' بہت جنگجو اور ماہر تیر انداز تھے۔ فتح مکہ کے بعد انہیں خیال ہوا کہ کہیں مسلمان ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ لہٰذا ان کا سردار مالک بن عوف نصری بیس ہزار آدمیوں کو لے کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے نکلا۔

مسلمانوں کا لشکر بھی مقامِ حنین پر پہنچا۔ ہوازن اور ثقیف کے بیس ہزار جنگجو تیر اندازوں نے صبح کی تاریکی میں حملہ کر دیا۔ پہلے تو مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ آخر کار تمام مسلمان نبیٔ رحمت ﷺ کے گرد جمع ہوئے۔ آپؐ نے بلند آواز سے فرمایا:

((اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ ، اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) (۱۶)

''میں اللہ کا نبی ہوں، یہ جھوٹ نہیں..... میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

اور پھر مشرکوں پر حملہ کا حکم دیا اور ساتھ ہی ایک مشت خاک دشمنوں کی طرف پھینکی اور فرمایا:

((شَاهَتِ الْوُجُوْهُ)) (۱۷)

''برے ہوئے یہ چہرے''۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنْهَزَمُوْا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ))

''قسم ہے ربِّ محمد (ﷺ) کی انہوں نے شکست کھائی''۔

اس پر دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے۔ کافی سارے بھاگ گئے اور ایک بڑی تعداد کو مسلمانوں نے قیدی بنالیا۔

شکست کے بعد ہوازن اور ثقیف کے سردار مالک بن عوف نے بھاگ کر طائف میں پناہ لی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں سے پوچھا کہ تمہارا سردار کہاں ہے جس نے تمہیں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑنے پر اکسایا تھا؟ تو لوگوں نے بتایا کہ وہ طائف بھاگ گیا ہے۔ آپؐ نے اس کے قبیلہ کے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اسے میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اگر وہ میرے پاس آ جائے تو میں نہ صرف اس کے اہل وعیال اور مال واپس کر دوں گا بلکہ اپنی طرف سے سو اونٹ بھی دوں گا۔ مالک بن عوف جو کہ طائف میں بہت پریشان حال تھا، یہ خبر سن کر اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اسے اپنی قوم کی سرداری کے علاوہ چند دیگر قبائل کا سردار بھی بنا دیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ مالک بن عوف نے مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مدح میں چند شعر بھی کہے ہیں۔ (۱۸)

رسولِ رحمت ﷺ کی شانِ کریمی

رسول اللہ ﷺ عفو و درگزر کرنے والے شخص سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حضرت یوسف علیہ السلام کی بے حد تعریف فرمایا کرتے تھے اور ان کا ذکر کرتے

ہوئے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے : ((اَلْکَرِیْمُ بْنُ الْکَرِیْمِ بْنِ الْکَرِیْمِ بْنِ الْکَرِیْمِ یُوْسُفُ بْنُ یَعْقُوْبَ بْنِ اِسْحَاقَ بْنِ اِبْرَاھِیْمَ))[19] اس بات پر غور کیجیے کہ ایسا کیونکر تھا؟ ملاحظہ فرمائیں!

۱) بھائیوں نے کنوئیں میں پھینکا' ان کو معاف فرمایا۔

۲) غلام بنا کر بیچنے والوں سے کبھی کوئی باز پُرس نہ کی۔

۳) عزیز مصر کی بیوی نے عفت وعصمت کو داغدار کرنا چاہا' اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پر جیل میں بھجوا دیا۔ آپؑ نے اقتدار ملنے کے باوجود کبھی انتقام لینے کی کوشش نہ کی۔

۴) قیدیوں کو بلا معاوضہ خواب کی تعبیر بتا دی۔

۵) عزیز مصر کو خواب کی تعبیر قیدی ہونے کے باوجود بتائی۔

۶) اپنے ساتھی قیدی سے جسے رہائی کے وقت آپؑ نے عزیز مصر کے لیے یہ پیغام دیا تھا کہ انہیں میرے معاملہ پر نظر ثانی کرنے کے لیے یاد دلانا لیکن وہ عزیز مصر کو یہ بات یاد نہ دلا سکا' حضرت یوسف علیہ السلام سے جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو آپؑ نے اس سے ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا۔

۷) اقتدار ملنے کے بعد اپنے بھائیوں کی مدد فرمائی اور انہیں قحط سالی میں غلہ کی فراہمی جاری رکھی۔

۸) بھائیوں نے چوری کا الزام لگایا۔ لیکن عظیم عہدے پر فائز ہونے کے باوجود انہیں کچھ نہ کہا اور ان کی بات کو بڑی ہمت سے برداشت کیا۔

۹) قیدی بنانے پر عزیز مصر سے کوئی جھگڑا پیدا نہیں کیا۔

۱۰) اقتدار حاصل ہونے کے بعد آپے سے باہر نہیں ہوئے' بلکہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار بن گئے اور مخلوق کو قحط سالی کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لیے پوری دیانت داری سے سرگرم رہے۔

صرف چند اسباب ذکر کر دیے گئے ہیں' جن کی بنا پر رسول اللہ ﷺ انہیں بڑے احترام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ قرآن پاک کی آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ.....﴾

(حٰمٓ السجدۃ:۳٤)

''نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتیں۔ آپ نہایت عمدہ طریقے سے معاملہ کو رفع دفع

فرمایا کریں۔''

رسول اللہ ﷺ اپنی عملی زندگی میں اس آیتِ مبارکہ کا مکمل نمونہ تھے۔ آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی پیروی کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے کہا: ''میں آپ کو ایسی گالی دوں گا جو قبر میں بھی آپ کے ساتھ داخل ہوگی'' (یعنی بدنامی مرتے دم تک آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گی) تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا: ''میرے ساتھ نہیں بلکہ تمہارے ساتھ قبر میں داخل ہوگی''(۲۰)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے برا بھلا کہا تو انہوں نے اس شخص سے کہا:

''اللہ کے بندے! مجھے برا بھلا کہنے میں مصروف نہ رہو۔ میل جول کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ ہماری وجہ سے جو شخص اللہ تعالیٰ کا نافرمان بنتا ہے، ہم اس سے انتقام نہیں لیتے، بلکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ مطیع وفرمانبردار بن جاتے ہیں۔''

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو بڑی عمدگی کے ساتھ اپنے معاملات میں سمولیا تھا:

((مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ مِنَ الدُّنْيَا جَرْعَةً اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ جَرْعَةِ غَيْظٍ رَدَّهَا بِحُلْمٍ اَوْ جَرْعَةِ مُصِيْبَةٍ رَدَّهَا بِصَبْرٍ))(۲۱)

''انسان دنیا میں کتنے ہی گھونٹ بھرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ غیظ وغضب کا وہ کڑوا گھونٹ ہے جس کا جواب انسان نہایت بردباری سے دیتا ہے یا پھر مصائب سے بھرپور وہ تلخ گھونٹ اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے جسے وہ صبر وہمت سے برداشت کرتا ہے۔''

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قیس بن عاصم منقری ہتھیار باندھے اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے اپنی قوم سے باتیں کر رہے تھے کہ ان کے پاس دو آدمیوں کو لایا گیا۔ ایک کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور دوسرا مقتول تھا۔ قیس بن عاصم سے کہا گیا کہ آپ کے بھتیجے نے آپ کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے حالانکہ وہ سراسر بے قصور تھا۔ قیس بن عاصم اپنے بھتیجے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ تو نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی ہے اور اپنے تیر سے اپنے آپ ہی کو نشانہ بنایا ہے، اپنے چچا زاد بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ پھر اپنے دوسرے بیٹے کو فرمایا: اٹھو اپنے بھائی کی تجہیز وتکفین کا بندوبست کرو، اس کی ماں کو ایک سو اونٹنی دیت ادا کرو، وہ بے سہارا ہوگئی ہے اور اپنے چچازاد بھائی کی مشکیں کھول دو۔

اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی لوگ پسند ہیں جو دوسروں کے ساتھ عفوودرگزر کا معاملہ کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾
(آل عمران)

''وہ لوگ غصے کو پی جاتے' لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

حالانکہ اللہ کی طرف سے آپ کی ذمہ داری صرف اس حد تک تھی کہ آپ اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ﴾

رسول اللہ ﷺ زندگی بھر انسانیت کی فلاح اور کامیابی کے لیے تڑپتے رہے۔ صرف ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ انسان جو اللہ تعالیٰ کے راستے کو چھوڑ کر شیطان کی راہ پر گامزن ہے' آخر کار ایسی آگ کے اس گڑھے میں گر جائے گا جو دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ گرم اور تکلیف دہ ہے' وہاں انسان کا کوئی مددگار اور غمگسار نہیں ہوگا۔ انسانیت کو اس آگ سے بچا لیا جائے۔ یہی احساس آپؐ کو دن رات چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اسی پریشانی نے آپؐ کی زندگی کو مضطرب کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ قرآن پاک کی اس آیت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشعراء)

''لوگوں کے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔''

اسی کیفیت کا اظہار تھا کہ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے ان دشمنوں کے لیے بھی کبھی بددعا نہیں نکلتی تھی جنہوں نے آپ کو لہولہان کر دیا اور اپنے شہر سے پتھر مار مار کر نکال دیا۔ دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾﴾ (الکھف)

''تو (اے نبیؐ!) شاید آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہوں اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے''۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کی زندگی کا سخت ترین اور تکلیف دہ دن کون سا تھا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''وہ طائف کا دن تھا''۔

☆ طائف کا واقعہ:

ابو طالب کی وفات کے بعد رسول کریم ﷺ کو قریش مکہ نے اتنا ستایا کہ آپؐ نے مکہ کو چھوڑ کر طائف کا ارادہ فرمایا تا کہ وہاں جا کر اُن کو دائرۂ اسلام میں لانے کی کوشش کریں۔ ثقیف کے تین سردار جو کہ آپس میں بھائی تھے' آپؐ ان کے ہاں تشریف لے گئے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی۔ لیکن ان کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا' بلکہ انہوں نے نہ صرف استہزائیہ کلمات کہے بلکہ اوباش قسم کے لڑکوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا' جنہوں نے آپؐ پر پتھروں کی بارش کر دی۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ آپؐ کے پاؤں مبارک کا نشانہ لے لے کر پتھر مارتے تھے جس سے آپؐ کے دونوں پاؤں مبارک خون آلود ہو گئے۔ اسی زخمی حالت میں آپ ﷺ نے ربیعہ کے دو بیٹوں عتبہ اور شیبہ کے باغ میں پناہ لی۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اپنا چہرہ جھکائے بے حد غم کی حالت میں بیٹھا تھا اور مجھے کوئی ہوش نہ تھا۔ اچانک میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو میں دیکھتا ہوں کہ ایک بادل مجھ پر سایہ فگن ہے۔ میں نے اس میں جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا جو مجھے پکار کر کہہ رہے تھے کہ اللہ ربّ العالمین نے ان لوگوں کی ساری باتوں کو سن لیا ہے اور آپ کی مدد کے لیے پہاڑوں والے فرشتے کو بھیجا ہے۔ آپ اسے جو حکم فرمائیں گے وہ پورا کرے گا۔ پھر اس فرشتے نے مجھے سلام کیا اور فرمایا:

"یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِکَ لَکَ وَاَنَا مَلَکُ الْجِبَالِ وَقَدْ بَعَثَنِیْ رَبُّکَ اِلَیْکَ لِتَاْمُرَنِیْ بِاَمْرِکَ فَمَا شِئْتَ' اِنْ شِئْتَ اَنْ اُطْبِقَ عَلَیْهِمُ الْاَخْشَبَیْنِ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((بَلْ اَرْجُوْ اَنْ یُخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ یَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا یُشْرِکُ بِهٖ شَیْئًا))(۲۲)

''اے محمد ﷺ! اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؐ کے بارے میں آپؐ کی قوم کی ساری گفتگو کو سن لیا ہے اور میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں' مجھے آپؐ کے ربّ نے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے تا کہ ان لوگوں کے بارے میں آپ جو ارشاد فرمائیں اسے بجا لاؤں۔ اگر آپ چاہیں تو ان سب کو ان دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں۔'' لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں' بلکہ میں اللہ کی ذات سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمائے جو صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کریں گے اور شرک سے باز رہیں گے''۔

☆ محاصرۂ طائف:

غزوۂ حنین کے بعد نبی کریم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا جو کافی طول پکڑ گیا اور اس کے فتح ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے گزارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ان کے حق میں بددعا فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بددعا کی اجازت نہیں' تو حضرت عمرؓ نے جواباً عرض کیا تو پھر ہمیں ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے محاصرہ اٹھا کر کوچ کرنے کا حکم فرمایا اور چلتے وقت بنوثقیف (اہل طائف) کے حق میں یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا)) (۲۳)

''اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے۔''

آپ ﷺ کی دعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور تھوڑے عرصہ بعد طائف کے سب لوگ مسلمان ہو گئے۔

☆ غزوۂ اُحد:

غزوۂ اُحد میں گھمسان کا رَن پڑا۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ مسلمانوں پر اچانک حملہ ہوا اور بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے۔ آپ ﷺ کے چار دانت مبارک شہید ہو گئے' سر مبارک زخمی ہوا' چہرۂ انور و اطہر خون آلود ہو گیا' خود کے حلقے رخسارِ مبارک میں پیوست ہو گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حالت کو دیکھ کر گزارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ دشمنوں کے لیے بددعا فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''میں بددعا اور لعنت کے لیے نہیں بھیجا گیا' بلکہ لوگوں کو دین حق کی طرف بلانے کے لیے بھیجا گیا ہوں''۔

اسی طرح جب قریش نے آپ ﷺ پر ظلم کے پہاڑ توڑے تو صحابہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! ان کے لیے بددعا فرمائیں''۔ آپؐ نے انکار فرمایا اور ان کے حق میں دعا کی:

((اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ)) (۲۴)

''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما' یہ لوگ بے خبر ہیں۔''

☆ یہودیہ کا آپ ﷺ کو زہر دینا:

فتح خیبر کے بعد چند روز رسول اللہ ﷺ وہیں قیام پذیر رہے۔ اس دوران زینب بنت حارث نے ایک بھنی ہوئی زہر آلود بکری ہدیہ کے طور پر آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کی۔ آپ ؐ نے چکھتے ہی کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ آپ ؐ نے اپنے ساتھی بشیر بن براء بن معرورؓ کو بھی کھانے سے منع کر دیا، جبکہ وہ کچھ کھا چکے تھے۔ یہودیہ عورت (زینب) کو بلا کر تحقیق کی گئی تو اس نے جرم کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ میں نے اس لیے ایسا کیا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور اطلاع فرما دیں گے اور اگر آپ سچے نبی نہیں ہیں تو لوگ آپ ؐ سے نجات پا جائیں گے۔ آپ ؐ نے اس سے زیادہ باز پُرس نہیں فرمائی، کیونکہ آپ ؐ اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے تھے۔ لیکن آپ ؐ کے ساتھی پر زہر نے اثر کیا جس کی وجہ سے وہ انتقال کر گئے تو آپ ؐ نے زینب کو اس کے قصاص میں قتل کر دیا۔ بیہقی کی روایت کے مطابق زینب اپنے جرم کا اقرار کرنے کے بعد اسلام لے آئی اور تمام حاضرین مجلس کو گواہ بنا کر کہنے لگی کہ مجھ پر آپ ؐ کا سچا ہونا واضح ہو چکا ہے، اس لیے میں آپ ؐ کا دین قبول کرتی ہوں۔ (۲۵)

حواشی

۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی۔
۲) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جاره بوایقه۔
۳) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحریم ایذاء الجار۔
٤) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا، ۸۱/۷۔
٥) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ما نهی عن السبّ۔
٦) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك۔
۷) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب، ۹۹/۷۔
۸) البدایة والنهایة، ۳۰۳/٤۔ وزرقانی ۳٤٦/۲۔
۹) الاصابة، ٥٦٥۔ وزرقانی ۳۱٥/۲۔
۱۰) البدایة، ٥۹٤/۲۔
۱۱) الاستیعاب، ۱۳۷/٤۔
۱۲) زرقانی ۳۱٦/۲۔
۱۳) کامل از ابن اثیر ۹٦/۲۔
۱٤) الاصابة، ۲٦/۳۔
۱٥) سیرت ابن هشام، ٤۳۹/٤۔
۱٦) صحیح البخاری۔ وصحیح مسلم۔

۱۷) صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فی غزوة حنین۔
۱۸) الاصابة، ۳۳۱/۳۔
۱۹) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، ۲۱٦/٥۔
۲۰) العقد الفرید، ۲۷٥/۲۔
۲۱) سنن ابن ماجه، کتاب الزهد ۔
۲۲) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة۔ وصحیح مسلم،کتاب الجهاد والسیر، باب ما لقی النبی من اذی المشرکین والمنافقین۔
۲۳) سنن الترمذی، کتاب المناقب ، باب فی ثقیف وبنی حذیفة۔ ومسند احمد۔
۲٤) طبقات ابن سعد، ۱۱٥/۲۔
۲٥) فتح الباری، ۳۸۰/۷ ۔

حُدود اللّٰہ

قرآن کریم کے تناظر میں

عتیق الرحمٰن صدیقی

''حدود اللہ'' سے مراد شریعت کے احکامات ہیں۔ یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے جو قرآن مجید میں چودہ بار استعمال ہوئی ہے۔ اس اصطلاح کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نکاح و طلاق، وراثت کی تقسیم، ظہار کے کفارہ، رمضان میں اعتکاف کے دوران ازدواجی روابط اور اللہ کے احکامات سے روگردانی اور اللہ کے محبوب اور پسندیدہ بندوں کی صفات کے حوالے سے تمام امور پر محیط ہے۔ حدود کی یہ اصطلاح احادیثِ مبارکہ میں بھی بیان ہوئی ہے اور فقہاء نے بھی اسے استعمال کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے ہم اجمالی طور پر اسے بیان کر رہے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿..... وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾

''.....اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو، یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں پس ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنی آیات (اپنے احکام) لوگوں کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔''

یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم ان حدود سے تجاوز نہ کرو، بلکہ کہا گیا کہ ان کے قریب تک نہ پھٹکو، اس لیے کہ سلامتی اسی میں ہے کہ آدمی سرحد سے دور رہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

((اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ))(۱)

''آگاہ رہو، یقیناً ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے، اور آگاہ رہو کہ یقیناً اللہ کی

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال و ترك الشبهات۔

محفوظ چراگاہ اس کی وہ حدیں ہیں جن سے اس نے حلال وحرام اور طاعت ومعصیت کا فرق قائم کیا ہے''۔

نبی اکرم ﷺ سے پہلے دورِ جاہلیت میں بیویوں کو طلاق دینے کا رواج عام تھا' خاوند بیوی کو بار بار طلاق دیتا اور رجوع کر لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاشرتی خرابی کی اصلاح کرتے ہوئے احکامات نازل فرمائے۔ سورۃ البقرۃ میں تیرہویں رکوع میں حدود اللہ کے الفاظ چھ بار استعمال ہوئے ہیں۔ طلاق کا شرعی طریقہ اور خاوند بیوی کے درمیان معاملات طے نہ ہونے کی صورت میں خلع کا طریقہ بتایا گیا اور ان طریقوں پر عمل پیرا ہونے کا حکم دے کر فرمایا گیا:

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلاَ تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٠﴾﴾

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں پس ان سے تجاوز نہ کرو' اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں تو وہی ظالم ہیں۔ پھر اگر شوہر نے (دوبارہ طلاق دینے کے بعد عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے' تو (اس صورت میں) وہ دونوں (پہلا شوہر اور عورت) اگر خیال کریں کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ ان لوگوں (کی ہدایت) کے لیے واضح کر رہا ہے جو (اس کی حدود کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں''۔

سورۃ النساء میں تقسیم میراث کے احکامات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا:

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۡ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾﴾

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں' اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ایسے لوگ ان

باغوں میں ہمیشہ رہیں گے‘ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا‘ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا‘ اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔‘‘

سید مودودیؒ اس آیۂ کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں یا ان دوسری قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا‘‘۔ (حاشیہ ۲۵‘ الف)

نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ جب اسلامی حکومت کا اقتدار وسعت پذیر ہونے لگا اور حجاز و نجد کے بڑے حصے پر چھا گیا تو مخالف قبیلوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں‘ مگر ان کے قبولِ اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد سے زیادہ مصلحت کوشی اور نفع پرستی پر مبنی تھی‘ وہ اسلام کی عائد کردہ اخلاقی بندشوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ یہ صحرائی و بدوی لوگ ناخواندہ اور جاہل ہونے کی بنا پر بھی اللہ کی حدود کی اہمیت سے شناسا نہ تھے۔ قرآن نے یہاں بھی حدود کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۹۷﴾﴾ (التوبۃ)

’’یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا‘ انتہائی حکمت والا ہے‘‘۔

اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان کی کہ وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں‘ فرمایا:

﴿اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآئِحُوۡنَ الرّٰكِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاهُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

''اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے' اس کی بندگی بجالانے والے' اس کی تعریف کے گن گانے والے' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے' اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مؤمن جو اللہ سے خرید وفروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی! ان مؤمنوں کو خوشخبری دے دو''۔

صاحب تفہیم القرآن نے ''اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے'' کی صفت کی وضاحت ذیل کے الفاظ میں کی ہے:

''یعنی اللہ تعالیٰ نے عقائد' عبادات' اخلاق' معاشرت' تمدن' معیشت' سیاست' عدالت اور صلح و جنگ کے معاملات میں جو حدیں مقرر کر دی ہیں وہ ان کو پوری پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں' اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انہی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں اور کبھی ان سے تجاوز کر کے نہ تو من مانی کارروائیاں کرنے لگتے ہیں اور نہ خدائی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی حدود کی حفاظت میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ ان حدود کو قائم کیا جائے اور انہیں ٹوٹنے نہ دیا جائے''۔ (التوبہ' حاشیہ ۱۱۰)

سورۃ المجادلۃ میں ظہار کا قانونی حکم بیان کیا گیا اور رجوع کرنے کی صورت میں جو شرط عائد کی گئی اس کے بارے میں فرمایا:

﴿..... فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

''.....تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور جو شخص یہ (غلام) نہ پائے تو اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں وہ دو مہینے کے پے در پے روزے رکھے۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' اور یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے۔''

اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ایک واضح حکم کو سننے کے بعد اس سے روگردانی کرتا ہے تو اس کا یہ طرزِ عمل ایمان کے منافی ہوگا۔ اسی طرح یہاں کافر سے مراد منکرِ خدا و رسالت نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدود اللہ کو توڑنا یا ان سے انحراف کرنا ایک کافرانہ طرزِ عمل ہے۔ گویا یہ کام کافروں کا ہے کہ اللہ و رسول کا حکم سننے کے بعد اپنی مرضی چلائیں یا جاہلیت کے طریقوں کی پیروی کرتے رہیں۔

سورۃ الطلاق میں بھی طلاق کے احکام بیان کیے گئے ہیں اور سورۃ کے آغاز میں فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُیُوْتِهِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾

''اے نبیؐ! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو، اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا ربّ ہے۔ (زمانۂ عدت میں) نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، اِلّا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔ اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا، وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا، تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ (موافقت کی) کوئی صورت پیدا کر دے۔''

حدود اللہ سے متعلقہ ان آیاتِ قرآنیہ پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ ان سب کا تعلق ان اساسی اور بنیادی اُمور سے ہے جو نہ صرف خاندان کی وحدت، اس کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں، بلکہ معاشرے کو انتشار و خلفشار اور فساد و اختلال سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی لازمی اور ضروری ہیں۔ اُمت مسلمہ میں مودّت و مؤانست، اخوت اور بھائی چارے کا انحصار بھی انہی پر ہے، ان سے کسی بھی قسم کی چھیڑ چھاڑ، من مانی تو جیہہ اور کمی بیشی اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اللہ کی باندھی ہوئی حدیں قرار دیا گیا ہے اور سخت الفاظ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کے قریب نہ پھٹکا جائے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ظالم کہا گیا اور انہیں توڑنے کے انجامِ بد سے ڈرایا گیا اور کہا گیا کہ جو اللہ و رسول کی نافرمانی پر اترے گا اور اللہ کی متعین کردہ حدوں کو پھاندے گا تو وہ

کافرانہ طرزِعمل کا مرتکب ہوگا۔ چنانچہ وہ جہنم کی آگ کا ایندھن بنے گا اور رسوا کن عذاب سے دوچار ہوگا۔

سید مودودیؒ نے اپنے تفسیری نوٹ میں اس آیت کو ایک بڑی خوفناک آیت سے تعبیر کیا' اللہ کے واضح حکم سے روگردانی کو ایمان کے منافی کہا اور اسے کافرانہ طرزِعمل قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ غفور ورحیم ہے' وہ چھوٹی موٹی غلطی پر دردناک عذاب کی وعید نہیں سناتا' بلکہ اس نے ان جرائم کے تناظر میں اہانت آمیز عذاب سے ڈرایا ہے جو معاشرتی تقدس کو پامال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مؤمنوں کی متعدد صفات بیان کیں اور ایک اہم صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ملک میں تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء کا نام نہاد ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' پر احتجاج بلاوجہ نہیں' وہ اسے حدوداللہ سے متصادم پا کر ہی واویلا کررہے ہیں۔ حکمرانوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ مذکورہ ایکٹ پر اٹھائے گئے اعتراضات کا بنظرِغائر جائزہ لیں اور ہٹ دھرمی کے بجائے اپنے موقف پر نظرثانی کریں۔oo

قرآن پر مشرکین کے اعتراضات

حافظ محبوب احمد خان

ایک سچی نبوت کی علامات یہ ہیں کہ اللہ کا نبی آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے' زنگ آلود نفوس اور سیہ کار قلوب کو جِلا دیتا ہے' لوگوں کو کتاب وحکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے' اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے' لوگوں کو اللہ کی دعوت دیتا ہے' نیکوکاروں کو بشارت دیتا ہے' بدکاروں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدۂ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔ کفار صداقت نبوت کی نشانی چاہتے ہیں۔ اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ نبوت ظاہری آیات اور مادّی نشانات سے خالی ہوتی ہے۔ تمام انبیاء کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی نشانیوں کے ساتھ ساتھ یہ ظاہری علامات بھی ان کی تصدیق کرتی ہیں۔ اصل میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کے ثبوت کے لیے اصل بنیاد نہیں ہیں' بلکہ نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار وعلامات یعنی خارق عادت معجزات تو صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں' اور جو تعصب وعناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ معاندین جو انبیاء کرام علیہم السلام کے مکارمِ اخلاق' حسن تعلیم و دیگر علمی وعملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرضِ شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ پیغمبر سے خارقِ عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کی دعوت پر شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے لایعنی سوالات کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ منکرین کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کی طلب میں نہیں ہوتیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں ہوتی ہیں جو اس لیے کہی جاتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کر لیا جائے۔ انبیاء کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ہمیشہ ایسا ہی طرزِ عمل رہا ہے۔ جب کبھی سچائی کی کوئی بات کہی جاتی ہے تو طلبِ حق رکھنے والی طبیعتیں اور کسی طرف نہیں جاتی ہیں' خود اسی بات پر غور کرتی ہیں

اور جب سچائی پا لیتی ہیں تو فوراً قبول کر لیتی ہیں۔لیکن ایک سرکش اور ہٹ دھرم آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا۔وہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ وہ کبھی ماننے والا نہیں ہے' پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنے نہ ماننے کے لیے کوئی جواز بنا لے۔ چنانچہ وہ طرح طرح کی ادھر ادھر سے باتیں نکالے گا' کبھی ایک اعتراض کرے گا کبھی دوسرا۔ پہلے ایک پر زور دے کر اس کا جواب طلب کرے گا' جب اس کا جواب مل جائے گا تو کوئی دوسرا اعتراض ڈھونڈ نکالے گا اور کہے گا کہ اس کا جواب تمہارے پاس نہیں۔ یہاں تک کہ اگر تم اس کی ساری کٹ حجتیوں کا جواب دے دو اور ساری شرطیں اور فرمائشیں پوری کر دو جب بھی وہ کوئی نہ کوئی اور اعتراض ڈھونڈ نکالے گا اور راست بازی کی راہ پر کبھی نہ چلے گا۔قرآن نے جا بجا منکرین نبوت و وحی کی اس حالت کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ کبھی ماننے والے نہیں۔اگر ماننے والے ہوتے تو اس قسم کی روش کبھی اختیار نہ کرتے۔

تاریخ انبیاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجزات انبیاء کی تصدیق کے لیے اللہ تعالیٰ لاتے ہیں مگر یہ ہدایت کے باب میں فیصلہ کن عنصر نہیں ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی فرد یا قوم نے کوئی معجزہ دیکھ کر ایمان قبول کیا ہو۔حضرت صالح علیہ السلام کے لیے اللہ کی اونٹنی ''ناقة الله'' کا معجزہ لایا گیا مگر اس بد بخت قوم نے اس معجزہ کی تصدیق کی بجائے تکذیب کی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بے شمار معجزات کے باوجود بنی اسرائیل کا جو حال تھا وہ ظاہر و باہر ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے شمار حسی معجزات دیے گئے مگر اس کے جواب میں جو طرزِ عمل ان کی قوم نے اپنایا وہ تکذیب کا تھا نہ کہ تصدیق کا۔اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبشر و نذیر بنا کر بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو ایمان کی دعوت دیں اور جو لوگ ان کی دعوت کو قبول کر لیں وہ آخرت میں فلاح پائیں۔تمام انبیاء اپنی اقوام میں حسب و نسب کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ کردار کے حامل تھے۔اعلانِ نبوت سے قبل وہ اپنے معاشرے میں عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے بلکہ مستقبل میں ان سے اُمیدیں وابستہ کی جاتی تھیں۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو مقامِ نبوت سے سرفراز فرماتا اور وہ دعوت الی اللہ کی جانب اپنی قوم کو بلاتے تو قوم ان سے نہ صرف اعراض کرتی بلکہ ہر ممکن طریقے سے دعوت الی اللہ کی مخالفت بھی کرتی۔ بے جا اعتراضات و اشکالات کی شکل میں مشرکین کی نفسیات کو قرآن نے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا ہے۔ جو سوالات و شبہات اور اشکالات ان کے ذہنوں میں آتے تھے قرآن نے اپنے ماننے والوں کو ان سے بچانے کے لیے انہیں بیان کر دیا ہے۔حقیقتاً یہ سوالات و اشکالات ہر ایسے معاشرے میں پیش آ سکتے ہیں

جس میں مشرکانہ افعال واقوال پھیلے ہوئے ہوں' اوران کا پھیلنا اور دعوتِ حق کے مقابلے میں آنا لازمی ہے' کیونکہ یہ شیطانی دعوت ہے جو حق سے روکنے کے لیے باطل کی صورت میں ہمیشہ حق کے مدمقابل ہوتی ہے۔قرآن کریم میں یہ اعتراضات وشبہات مختلف مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔تاہم اس موضوع پر سورۃ الانعام' سورۂ بنی اسرائیل' سورۃ الفرقان' سورۃ سبا' سورۃ الزمر اور سورۃ الزخرف نمایاں ہیں' جہاں یہ مضمون اپنی پوری وضاحتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ان اعتراضات کے جوابات کے ضمن میں ہمیں قرآن کریم میں تین طرح کا اسلوب نظر آتا ہے۔ پہلا تو یہ ہے کہ اعتراض کے ساتھ ہی جواب بھی بیان کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ سوال ایک مقام پر اور اس کا جواب کسی دوسرے مقام پر دیا جاتا ہے۔تیسرا اسلوب یہ ہے کہ ان کے اعتراض کو قرآن نے بیان نہیں کیا بلکہ صرف جواب پر اکتفا کیا ہے۔

ایک اور چیز ان اعتراضات میں نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ ان اعتراضات کی بنیاد میں دو چیزیں نمایاں ہیں۔ایک توحید باری تعالیٰ اور دوسرے انکارِ آخرت ☆۔اوران اعتراضات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ضلالت! سورۂ بنی اسرائیل کا ایک جامع مقام ہے جہاں پر تینوں چیزیں مجتمع ہوگئی ہیں۔ارشادِ ربانی ہے:

☆ آخرت ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔اس میں حسب ذیل عقائد شامل ہیں:

۱) یہ کہ انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

۲) یہ کہ دنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر' جسے صرف خدا ہی جانتا ہے' اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔

۳) یہ کہ اس عالم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی' بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا' اوران سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا' اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

۴) یہ کہ اللہ کے اس فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بدٹھہریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

۵) یہ کہ کامیابی وناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی وبدحالی نہیں ہے' بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو اللہ کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھہرے اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے' کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار' اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو تو وہ اس راستہ پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔(تفہیم القرآن' جلد ا' ص ۵۲)

﴿وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾﴾ (بنی اسراء یل)

''جب تم قرآن پڑھتے ہوتو ہم تمہارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں۔اوران کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ کچھ نہیں سمجھتے' اوران کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں' اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی ربّ کا ذکر کرتے ہوتو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب وہ کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں تو دراصل کیا سنتے ہیں اور جب بیٹھ کر باہم سرگوشیاں کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں' یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں یہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے جس کے پیچھے تم لوگ جا رہے ہو۔دیکھو' کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں' یہ بھٹک گئے ہیں' انہیں راستہ نہیں ملتا۔''

سورۃ الزمر میں یہ مضمون مزید وضاحت سے بیان ہوا ہے:

﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾

''جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں' اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکا یک وہ خوشی سے کھل اُٹھتے ہیں''۔

انکارِ آخرت کی وجہ قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۭ﴿۲﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۭ﴿۳﴾ بَلٰي قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ﴿۵﴾ يَسْـَٔـلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾﴾ (القیٰمۃ)

''نہیں' میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔اور نہیں' میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے

والے نفس کی۔ کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟''

ایک اللہ کو پوری طرح ماننے سے انکار اس لیے ہے کہ اللہ کے تصور کے ساتھ ہی اس کی صفات اور جزا و سزا کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے' چنانچہ دنیا میں اپنے رویے کو تبدیل کرنا پڑتا ہے اور اسی کے لیے انسان تیار نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے منکرین قرآن کے اعتراضات کو مختلف پہلوؤں سے اس طرح بیان کیا ہے۔

اوّل : کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو!

﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾﴾ (یونس)

''جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے نبیؐ ' ان سے کہو: میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں' میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے' اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے''۔

دوم : سارا قرآن ایک ہی مرتبہ کیوں نہ اُتار دیا گیا؟

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ﴿۳۳﴾﴾ (الفرقان)

''منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا؟ ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی

نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے' اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔''

سوال: قرآن کسی رئیس پر نازل ہونا چاہیے؟

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٣٢﴾﴾ (الزُّخرف)

''اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں' اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں' اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔''

چہارم: قرآن ہماری آنکھوں کے سامنے نازل ہو!

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِىَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾﴾ (الاسراء)

''اور انہوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے' یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے' اور تیرے چڑھنے کا

بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ ان نبیؐ! ان سے کہو: پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟''

اس اعتراض کا تفصیلی جواب سورۃ الانعام میں یوں دیا گیا ہے:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (الانعام)

''اے پیغمبرؐ! اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے''۔

پنجم: قیادت وسیادت پر اندھا اعتقاد

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِالْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ (سبا)

''یہ کافر کہتے ہیں ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے' کاش تم دیکھو ان کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے' اُس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے' جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: کیا ہم نے

تمہیں اُس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے، اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں؟ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے!''

ان کے اس اعتراض کی نفسیات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۳۵ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۶﴾ (سبا)

''انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ اے نبیؐ! ان سے کہو: میرا رب جسے چاہتا ہے، کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا عطا کرتا ہے، مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔''

شُبہ: قرآن آپؐ نے خود گھڑ لیا ہے!

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶﴾ (الفرقان)

''جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی غفور و رحیم ہے''۔

ھفتم : قرآن میں حقیر مثالیں دی گئی ہیں!

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾﴾ (البقرۃ)

''ہاں' اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں' وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو اُن کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے' اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے' اور اس سے گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں''۔

ھشتم : قرآن کو شیاطین لے کر اُترے ہیں!

﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾﴾ (الشُّعراء)

''اس (کتاب مبین) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ نہ یہ کام اُن کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دُور رکھے گئے ہیں''۔

مزید تفصیل سے جواب ان آیات میں دیا گیا ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾﴾ (الشُّعراء)

''یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اُتری ہے' تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں' صاف صاف عربی زبان میں''۔

نہم : قرآن غیر عربی میں کیوں نازل نہ ہوا؟

﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ﴾

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ (حٰمٓ السجدة)

''اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی! ان سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے' مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو''۔

دھم : قرآن پیروئ رسول کا حکم دیتا ہے

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾﴾ (المدّثّر)

''آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں؟ گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔ بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں۔ ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔''

پس منکرین کا اصل مرض توحید باری تعالیٰ اور ایمان بالآخرت کا انکار ہے' اور قرآن کریم کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ انہی دونوں نظریات پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ قرآن کریم کے طالب علم جانتے ہیں کہ مکی قرآن کی سورتوں کے تین بڑے موضوعات میں سے دو توحید اور ایمان بالآخرۃ ہیں۔ لہٰذا جب تک انسان ان کو پوری طرح قبول نہ کرے اس کی جانب سے کسی قسم کا دعوائے ایمان نا قابل قبول ہے۔ oo

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''

(رواہ البخاری' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

انسانی شخصیت پر حلال وحرام کے اثرات

محمد رشید عمر ☆

دین اسلام میں اللہ نے انسان کے لیے کچھ چیزوں اور معاملات کو جائز اور حلال قرار دیا ہے' ان کو استعمال کرنے اور انہی پر اکتفا کرنے کی ترغیب دی ہے اور بدلے میں دنیا و آخرت میں کامیابی اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ جبکہ کچھ دوسری چیزوں اور معاملات کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے' ان سے رکنے اور باز رہنے کی پُرزور تاکید کی ہے اور باز نہ رہنے کی صورت میں دنیا و آخرت میں خسارے اور عذابِ الیم کی وعید سنائی ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کی آیات ملاحظہ ہوں:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ﴿۳۶﴾﴾ (النّساء)

''اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو' اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور قرابت دار ہمسایہ سے اور اجنبی ہمسایہ سے اور پہلو کے ساتھی سے اور راہ کے مسافر سے بھی اور ان سے بھی جن کے مالک تمہارے ہاتھ ہیں (یعنی غلام' کنیز) یقیناً اللہ

☆ امیر تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب غربی

تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا۔''

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (البقرة)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم پر مردہ' اور (بہا ہوا) خون' اور سور کا گوشت' اور ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو' حرام کیا ہے۔ پھر جو مجبور ہو جائے بشرطیکہ سرکشی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو' اس پر (ان کے کھانے میں) کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے۔''

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرة)

''اور ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھایا کرو اور نہ حاکموں کو رشوت پہنچا کر کسی کا کچھ مال ظلم وستم سے ہڑپ کر لیا کرو' حالانکہ تم جانتے ہو۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (البقرة)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔''

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ﴾ (البقرة:۲۲۱)

''اور تم شرک کرنے والی عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں''۔

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ﴾ (البقرة:۲۲۱)

''اور نہ شرک کرنے والے مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۗءٌ مِّنْ نِّسَاۗءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ

يَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۱۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۲﴾﴾ (الحُجُرٰت)

''اے ایمان والو! مَرد دوسرے مَردوں کا مذاق نہ اڑائیں ممکن ہے کہ یہ (جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے) ان سے بہتر ہوں (جو مذاق اڑا رہے ہیں) اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ یہ ان (مذاق اڑانے والیوں) سے بہتر ہوں، اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور نہ کسی کو برے لقب دو۔ ایمان کے بعد فسق برا نام ہے۔ اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔ اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو! یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں، اور بھید نہ ٹٹولا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ اس سے تو تم کو گھن آئے گی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴿۵۱﴾﴾ (المائدۃ)

''اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو بھی ان سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے۔ ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہِ راست نہیں دکھاتا۔''

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴿۳۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا﴿۳۲﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا﴿۳۳﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا

بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ (بنی اسراء یل)

''اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو۔ان کو بھی ہم ہی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔اور خبردار زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا' یقیناً یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔اور کسی جان کو جس کا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے' ہرگز ناحق قتل نہ کرنا۔اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے' پس اسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادتی نہ کرے۔ بے شک وہ مدد کیا گیا ہے۔اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ بجز اس طریقہ کے جو بہت ہی بہتر ہو' یہاں تک کہ وہ اپنی بلوغت کو پہنچ جائے۔اور وعدے پورے کیا کرو' یقیناً قول وقرار کی باز پرس ہونے والی ہے۔اور جب ناپنے لگو تو بھرپور پیمانہ سے ناپو اور سیدھی ترازو سے تولا کرو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت اچھا ہے۔اور جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ' یقیناً کان' آنکھ اور دل' ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔اور زمین پر اکڑ کر نہ چل کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے۔''

اوامر ونواہی کا ایک ایسا وسیع سلسلہ ہے جو انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ یہ سلسلہ فرد سے لے کر انسان کی پوری اجتماعیت کے معاملات تک کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔فرمانِ رسولؐ میں اسے اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ بندۂ مؤمن کی مثال کھونٹے پر بندھے ہوئے گھوڑے کی سی ہے۔ وہ رسے کی لمبائی کے برابر دائرے میں چراگاہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے' اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بات کو سمجھنے کے لیے زندگی کے چند نمایاں گوشوں کو سامنے رکھیے۔مثلاً معاش' معاشرت' سیاست اور معاملات' ان سب میں انسان کے لیے دو دروازے کھلے ہیں جن کے متعلق حلال اور حرام کے ذیلی عنوانات کے تحت اشارہ کیا گیا ہے:

معاش میں		کھانے پینے میں		معاشرت میں		سیاست میں	
حلال	حرام	حلال	حرام	حلال	حرام	حلال	حرام
جائز ذرائع آمدنی سے کمائی، مزدوری، تجارت، زراعت وغیرہم	ناجائز ذرائع آمدن سود، رشوت، جوا، سٹہ بازی وغیرہم	اللہ کے نام پر ذبح شدہ گائے، بکری، اونٹ، مچھلی، پرندوں کا گوشت اور دوسری غذائی اشیاء	غیراللہ کے نام پر ذبح شدہ حلال جانور، سود، شراب، سانپ، درندے اور دوسری غذائی اشیاء	جائز نکاح، پردے کا لزوم، ادب، احترام	بدکاری، تبرج، اور مخلوط مجالس۔ ادب اور احترام کا نہ ہونا	حقوق کی ادائیگی، جان و مال کا تحفظ، عدل و انصاف	حقوق کا غصب، بدامنی، فساد، ظلم اور ناانصافی، دھونس، دھاندلی

ذاتِ انسانی

یہ سب عوامل ذاتِ انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے بناؤ اور بگاڑ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایسا انسان جو اپنے خالق کی اطاعت کرتا ہے، حلال ذرائع سے اپنی روزی کماتا ہے، کھانے میں پاکیزہ چیزیں استعمال کرتا ہے، دوسروں کے حقوق کی ادائیگی اور اپنی عزت و عظمت کی حفاظت کرتا ہے وہ اس شخص سے مختلف ہے جس نے ان اُمور میں برعکس طرزِ عمل اپنا رکھا ہے۔ ایک اخلاق کا نمونہ ہے، جبکہ دوسرا بداخلاقی کی تصویر۔

اصل میں یہی معاملات انسانی اخلاق کے سنوارنے یا بگاڑنے میں اصل رول ادا کرتے ہیں۔ اخلاق اچھے ہوں یا برے، انسانی ذات سے پھوٹتے ہیں۔ یہ کہیں خارج سے خرید کر دوا کی گولی یا ٹیکے کی صورت میں جسم انسانی میں داخل نہیں کیے جاسکتے۔ ان کی پیداوار ذاتِ انسانی ہے جو ان کے لیے ایک کھیت کی مانند ہے، جس میں اخلاق کی فصل اگتی ہے۔ اگر اس زمین پر

جائز ذرائع آمدن' پاکیزہ خوراک' حیا' شرم' دیانت وامانت کے ساتھ ساتھ اطاعت خداوندی کی بارش برستی رہتی ہے تو اس کی مٹی پاک رہتی ہے اور اچھے اخلاق جنم لیتے ہیں' ورنہ یہی انسانی ڈھانچہ بُرے اخلاق کا منبع بن جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۗ﴾ (الاعراف:۵۸)

''اور پاکیزہ زمین تو اپنے ربّ کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے' اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا''۔

اخلاق حیاتِ انسانی کا وہ اہم ترین حصہ ہے جس کے ذریعے معرفتِ ربانی حاصل ہوتی ہے۔ اہل منطق کے نزدیک وجودِ ذاتِ باری تعالیٰ کا کوئی ثبوت نہیں ہے' لیکن ان سے اخلاقی صفات کے وجود کے بارے میں سوال کیا جائے تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ دیانت' امانت اور سچائی کی قوت ہو یا ظلم و بے حیائی ہو' ان کے سرچشموں کی نشاندہی ممکن ہے وہ نہ کر سکتے ہوں' لیکن ان کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے۔ اگر یہ چیزیں ہیں تو ان کی پہچان فطرت انسانی میں کس نے پیدا کی ہے؟ وہ صرف ایک اللہ' کائنات کا پیدا کرنے والا مدبر ہے جس نے **اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا** کا کام کیا ہے۔

فجور اور تقویٰ کی فصل اگنے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان خالق کائنات کے معین کیے ہوئے حلال وحرام کے دائرے میں رہتا ہے یا اس کو توڑ کر خالق کی معرفت سے اندھا ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے' حیاتِ انسانی کا وہ اہم ترین حصہ جہاں سے معرفتِ ربانی کا دروازہ کھلتا ہو' وہ کام خالقِ حقیقی کے علاوہ بھی کوئی کر سکتا ہے؟ یا کسی اور کے سپرد کیا جا سکتا ہے جو یہ فیصلہ کرے کہ یہ چیز انسان کے لیے حلال ہے یا حرام ہے؟ صرف وہی ذات جانتی ہے کہ کون سے معاملات انسان کے لیے اس لحاظ سے بہتر ہیں کہ جن کو اختیار کر کے اعلیٰ اخلاق والا انسان جنم لے سکتا ہے اور کن چیزوں میں پڑ کر انسان انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔ اسی کی دی ہوئی ہدایات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سود خوری بھی انسان کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جتنا کوئی بدترین بدکاری کا کام۔ بدکاری بھی انسانی جسم کو اسی طرح خراب کر دیتی ہے جتنا گلا سڑا گوشت۔ سؤر' شراب اور خنزیر کا گوشت بھی انسانیت کے لیے اتنا ہی مضر ہے جتنا رشوت' چوری اور ڈاکہ۔ غیبت بھی اتنی ہی قابل نفرت

ہے جتنا مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ بدنظری بھی اتنی ہی روحانی ظلمت کا سبب بنتی ہے جتنا ناجائز شہوت رانی وغیرہم۔

چنانچہ اس روشنی میں اگر ہم دیکھنے کے قابل ہو جائیں تو وہ لوگ جو آزاد جنسی زندگی، سؤر کے گوشت، شراب اور سود کے جواز پر فلسفیانہ بحث کرتے ہیں، جائز ناجائز طریقے سے دنیاوی مال ومتاع اور لذات کے حصول کو جائز گردانتے ہیں، گناہ اور ثواب کی حکمت کو نہیں مانتے ان کے لایعنی فلسفہ کی قلعی کھل جاتی ہے اور خالق کائنات نے حلال اور حرام کے جو احکامات ہم پر واضح کیے ہیں اس کی حکمت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور بے اختیار زبان سے نکلتا ہے:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (آل عمران)

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرة)

ویلنٹائن ڈے

بُت پرست رومیوں کا تہوار

ڈاکٹر گوہر مشتاق (امریکہ)

قوموں کی غلامی میں سب سے خطرناک قسم ذہنی غلامی ہے۔ اِسی کے متعلق اقبالؔ نے فرمایا ہے: ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

آج مسلمانوں میں جو غیر اسلامی رسومات پھیل رہی ہیں اُن میں سب سے قوی محرک مغرب کی ذہنی علامی ہے جو مسلمانوں کے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ البرٹ میمی (Albert Memmi) نے جو تونس کا ایک یہودی مصنف ہے، اپنی کتاب ''The Colonizer & The Colonized'' (غالب قوم اور مغلوب قوم، مطبوعہ امریکہ ۱۹۹۱ء) میں انتہائی گہرائی میں اُن نفسیاتی عوامل کا ذکر کیا ہے جو ایک مغلوب قوم میں احساسِ کمتری کی وجہ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ مغلوب قوم کے باشندوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ چونکہ وہ غالب قوم سے ذہنی طور پر مرعوب ہوتے ہیں اور اس پر رشک بھی کرتے ہیں اس لیے انہیں اپنے آقاؤں کی نقل کرنے میں ذہنی تسکین ہوتی ہے، کیونکہ انہیں اپنے آقاؤں میں قوت اور اقتدار نظر آ رہا ہوتا ہے۔

آج پاکستان کے مسلمان نوجوانوں میں جو غیر اسلامی (بلکہ بُت پرستانہ) رسومات پائی جاتی ہیں اُن میں سے ایک رسم ۱۴ فروری کو ویلنٹائن ڈے (Valentine Day) منانا ہے۔ یہ بیماری پاکستان میں پچھلے پانچ برسوں میں طاعون اور ہیضے کی وبا کی سی تیزی سے پھیلی ہے۔ ٹی وی ڈراموں، میوزک شوز، کیبل، ڈش، انٹرنیٹ گپ شپ (chatting) اور سیل فونوں کی بدولت ویلنٹائن ڈے کی بیماری نے پاکستان کے بڑے شہروں سے نکل کر قصبوں اور دیہاتوں تک کے لڑکے لڑکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

ویلنٹائن ڈے کی تاریخ

عیسائیوں کے اکثر تہواروں کی طرح ویلنٹائن ڈے کی جڑیں بھی بُت پرست رومیوں تک پہنچتی ہیں۔ قدیم روما میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ایک تہوار منایا جاتا تھا۔ اس تہوار میں کنواری لڑکیاں محبت کے خطوط لکھ کر ایک بہت بڑے گلدان میں ڈال دیتی تھیں۔ اس کے بعد محبت کی اس لاٹری میں سے روم کے نوجوان لڑکے ان لڑکیوں کا انتخاب کرتے جن کے نام کا خط لاٹری میں ان کے ہاتھ آیا ہوتا۔ پھر وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کورٹ شپ (courtship) کرتے، یعنی شادی سے پہلے آپس میں ہم آہنگی (understanding) پیدا کرنے کے لیے ملاقاتیں کرتے۔ Webster's Family Encyclopedia (مطبوعہ امریکہ ۱۹۸۷ء) کے مطابق عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں نے اس مشہور بُت پرست رسم کو ختم کرنے کی بجائے اسے سینٹ ویلنٹائن ڈے کے تہوار میں بدل دیا۔ علاوہ ازیں انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے مطابق سینٹ ویلنٹائن (جس کی وفات ۲۶۹ء میں ہوئی) کی زندگی کا اس تہوار یا جو کچھ اس تہوار میں کیا جاتا ہے، اُس سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلام میں شادی سے پہلے کے تعلقات کی اجازت نہیں

اسلام میں کورٹ شپ کی اجازت نہیں۔ اسلام میں جہاں آزاد شہوت رانی حرام ہے وہاں چوری چھپے آشنائیاں بھی حرام ہیں۔ (النساء:۲۵) اسلامی تعلیمات کے مطابق لڑکی لڑکے کا جب تک نکاح اور رخصتی نہ ہو جائے وہ ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہی رہتے ہیں، صرف منگنی انہیں محرم نہیں بنا سکتی۔ یہ جو ٹی وی ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے کہ منگنی کے بعد لڑکے لڑکیاں ٹیلی فون پر رابطے کرتے ہیں، تنہائیوں میں ملتے اور عشقیہ گفتگو کرتے ہیں، پارکوں اور دریاؤں کے کنارے، کھلی فضا میں پکنک مناتے ہیں یا کاروں میں تنہا سیر و تفریح کرتے ہیں، اور ایسے ہی ویلنٹائن ڈے پر محبت بھرے کارڈز کا تبادلہ کرنا یا چاکلیٹیں وغیرہ دینا یہ سب اسلامی شریعت کی رو سے حرامِ مطلق اور غیر مسلم قوموں کی نقالی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))(۱)

''جو کسی قوم کی نقالی کرتا ہے وہ اُسی میں سے ہوتا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسلامی کلچر کی سب سے بڑی خصوصیت

(۱) سنن ابی داوٗد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة۔

''شرم وحیا'' بتائی ہے:

((اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ)) (۱)

''بے شک ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے۔''

عربی زبان میں لفظ ''حیا'' اور ''حیات'' (زندگی) کا مادۂ اصلی ایک ہی ہے۔ گویا اُمت مسلمہ کی زندگی ''شرم وحیا'' سے ہے اور بے حیائی میں مسلمان قوم کی موت ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تنبیہہ فرمائی:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)) (۲)

''اگر تم حیا نہ کرو تو جو چاہو کرو''۔

دین اسلام فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ اسلام غیر محرم مردوں عورتوں کے شادی سے باہر کے تعلقات کی اجازت نہیں دیتا' کیونکہ کورٹ شپ یا لڑکی لڑکے کی شادی سے پہلے کی دوستی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگیوں کے صرف روشن پہلو ہی دکھاتے ہیں۔ ایسے آزادانہ ماحول میں سب سے زیادہ گھاٹا عورت کو ہوتا ہے' کیونکہ کینیڈا کے نومسلم عالم دین ڈاکٹر بلال فلپس کا کہنا ہے:

''عورتیں معاشرے کا جسمانی لحاظ سے کمزور حصہ ہوتی ہیں اور مرد مضبوط۔ جب بھی مضبوط اور کمزور کا آزادانہ میل جول ہوگا تو مضبوط کمزور کا استحصال کرے گا''۔

جدید ٹیکنالوجی سے بے حیائی میں اضافہ

آج ٹی وی ڈراموں' میوزک شوز' لچر افسانوں اور فلموں کے ذریعے نوجوانوں کے جنسی جذبات کو نہ صرف مشتعل کیا جاتا ہے بلکہ انہیں معاشقوں کے جدید ترین طریقے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد نوجوان لڑکے لڑکیاں ای میل' انٹرنیٹ چیٹنگ اور سیل فون (جس کے اندر اَب بے حیائی کو مزید بڑھانے کے لیے کیمرے کی سہولت مہیا کر دی گئی ہے) کے ذریعے معاشقے کرتے ہیں اور ویلنٹائن ڈے کے دن ان کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اس دن پاکستان کے بڑے شہروں میں میوزیکل کنسرٹس منعقد کیے جاتے ہیں جو بے حیائی کا مرقع ہوتے ہیں اور اُس میں شمولیت اختیار کرنے والے لڑکے لڑکیوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ سب سرخ قمیصیں (red shirts) زیب تن کر کے آئیں اور ایک دوسرے کے جذبات کو

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب الحیاء۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب حدیث الغار۔

بھڑکائیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسائی آرٹ میں سرخ رنگ کو شیطان کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ شیطان انسان کو اسی بے حیائی کا درس ہی تو دیتا ہے جس کے مظاہرے کے لیے نوجوان سرخ لباس پہن کر میوزیکل شوز میں شامل ہوتے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (البقرۃ:۲۶۸)

''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔''

مسلمانوں کے دو ہی تہوار ہیں

مسلمانوں کے دو ہی تہوار ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہیں، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ انہی دو تہواروں پر ہمیں فخر ہونا چاہیے۔ زندہ قومیں دوسری اقوام سے تہوار مستعار نہیں لیا کرتیں۔ یہودی ایک زندہ قوم ہیں۔ وہ امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے مذہب کی تعلیمات پر سختی سے کاربند ہیں۔ یہودی نوجوان لڑکے لڑکیوں کو کبھی ویلنٹائن ڈے مناتے نہیں دیکھا گیا۔ ہندو بھی ایک بیدار قوم ہیں۔ دو سال پہلے یہ خبر امریکی رسالے USA Today (۱۴ فروری ۲۰۰۳ء) میں چھپی تھی جس کا عنوان تھا:

"Anti-Valentine's Day activists erupt in India"

یعنی ''ویلنٹائن ڈے کے مخالفین انڈیا میں ظاہر ہو گئے''۔

اس کے مندرجات میں بتایا گیا تھا کہ ویلنٹائن ڈے کے مخالفین نے ممبئی اور دیگر شہروں میں ''انڈین کلچر کو بچاؤ'' کے نعروں کے ساتھ کارڈز بیچنے والی دکانوں پر چھاپے مار کر ویلنٹائن ڈے کے کارڈز کو آگ لگا دی۔ کیونکہ ان کے مطابق یہ تہوار نوجوانوں میں جنسی آوارگی (promiscuity) پیدا کر رہا ہے۔ وہاں کی شیوسینا پارٹی کے لیڈر بال کالسیکر نے کہا: ''ویلنٹائن ڈے انڈین سوسائٹی کے اخلاق اور کلچر کے خلاف ہے''۔ شیوسینا کے دوسرے سیاسی لیڈر اِشور سنگھ چوہدری نے رائٹرز نیوز (Reuters) کو بغیر کسی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیے پوری خود اعتمادی کے ساتھ انٹرویو میں کہا:

''یہ ویلنٹائن ڈے ایک فیشن بن گیا ہے۔ یہ ہمارے نوجوانوں کے کردار کو خراب (spoil) کر رہا ہے''۔

ذرا غور کریں، یہ پاکستان کا کوئی مولوی یا عالمِ اسلام نہیں بول رہا کہ ہم اُس پر ''تنگ نظری'' کا ٹھپہ لگا سکیں، یہ الفاظ ایک سیکولر ملک کے ایک سیاست دان کے ہیں۔

مغرب کا جنسی انقلاب اور اسلام

مغرب میں جدید جنسی انقلاب (Sexual Revolution) کا آغاز ۱۹۶۰ء کی دہائی میں نوجوانوں کی تحریک حریت (Teenage Liberation Movement) کے ساتھ ہوا' لیکن اس کی جڑیں یونانی اور رومی تہذیب کی جنسی انارکی سے جا کر ملتی ہیں۔ کیتھولک چرچ کی جنسیت کے معاملے میں سختی دراصل بُت پرست رومیوں کی انتہائی شہوت رانی کے خلاف ردِّعمل تھا جس کی وجہ سے وہ دوسری انتہا کو چلے گئے' جس طرح پینڈولم ایک انتہا سے دوسری انتہا کو جاتا ہے۔ اگرچہ کئی معاملات میں عیسائیت کو سمجھوتا کرنا پڑا' مثلاً انہوں نے مشرکین کی ویلنٹائن ڈے کی رسم کو برقرار رکھا' البتہ اُسے اپنے ایک ولی سینٹ ویلنٹائن کے ساتھ منسوب کر کے مذہبی رنگ دے دیا۔

موجودہ عیسائیت کے بانی سینٹ پال کو خود محبت میں ناکامی ہوئی تھی۔ نوجوانی کے دَور میں جب سینٹ پال یہودی تھا اُسے یہودیوں کے ایک بہت بڑے مذہبی عالمِ دین کی بیٹی سے' جو انتہائی خوبصورت تھی' عشق ہو گیا تھا' لیکن اُس کی شادی ایک رومن حکمران سے کر دی گئی تو سینٹ پال نے غصے میں آ کر عیسائیت اختیار کر لی (بحوالہ Jesus: the Prophet of Islam' مصنف محمد عطاء الرحیم اور احمد تھامسن) غالباً اسی وجہ سے سینٹ پال نے نہ صرف یہ کہ خود شادی نہ کی بلکہ اُس نے دوسروں کو بھی جائز ازدواجی تعلقات سے بھی کنارہ کشی کا درس دینا شروع کر دیا۔ عیسائیوں کے دوسرے بڑے مذہبی عالم سینٹ آگسٹائن (متوفی ۴۳۰ء) نے اپنی روحانی خودنوشت سوانح عمری ''The Confessions'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نوجوانی کے دَور میں وہ طوائفوں کے پاس باقاعدگی کے ساتھ جایا کرتا تھا اور ساتھ ساتھ خدا سے دعا کیا کرتا تھا:

"Oh God! Grant me faith but not yet."

''اے اللہ! مجھے ایمان عطا فرما' لیکن ابھی نہیں!''

پھر سینٹ آگسٹائن نے مذہبیت اختیار کی تو اس نے جائز ازدواجی تعلقات سے بھی اجتناب کا درس دینا شروع کر دیا۔ اسی طرح سینٹ جیروم نے بڑے شدّ ومدّ سے کہا کہ عیسائی عقیدے کے مطابق جو شخص اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے وہ شخص بھی بدکار ہے۔ اور اس نظریے کی کچھ عرصہ پہلے ۱۹۸۰ء میں آنجہانی پوپ جان پال دوم نے بھی تائید کی ہے۔ یہ عیسائیت کی

انہی غیر فطری سختیوں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی میں مغرب میں جنسی انقلاب رونما ہوا اور آج میڈیا پوری دنیا میں اسے پھیلا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم ویلنٹائن ڈے کو اس جنسی انقلاب کا جنم دن (Birthday) قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے اور مسلمان قوم کو اللہ تعالیٰ نے ''اُمت وسط'' بنایا ہے۔ سینٹ جیروم کے بیوی سے محبت کے نظریے کے برخلاف رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

((تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ)) (۱)

''تم بہت محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورتوں سے شادی کرو''۔

رسول اللہ ﷺ نے رہبانیت کی دوٹوک انداز میں نفی کرتے ہوئے فرمایا:

((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) (۲)

''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔''

چنانچہ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام شادی کے خلاف نہیں' بلکہ وہ واحد مذہب ہے جو شادیاں جلدی کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ﴾ (النور:۳۲)

''اور تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں' اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو۔''

البتہ اسلام غیر فطری اور غیر ازدواجی تعلقات کے یکسر خلاف ہے۔ شادیوں میں بے جا اسراف اور اخراجات کی وجہ سے پاکستان میں شادیوں میں انتہائی تأخیر کی جاتی ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں بہت سی اخلاقی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے نوجوانوں سے فرمایا:

((مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ)) (۳)

''تم میں سے جو شخص شادی کر سکتا ہو اُسے کر لینی چاہیے' کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت کو قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔''

قرآن کی سورۃ الروم (آیت ۲۸) میں میاں بیوی کے درمیان محبت اور رحمت کا ذکر ہے

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب النکاح' باب النهی عن تزویج یلد من النساء۔

(۲) فتح الباری۔ ۱۰۲/۱ و ۱۳/۹۔ سلسلة الاحادیث الصحیحة ۳۸۷/٤۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب الصوم لمن خاف علی نفسه العزبة۔ وصحیح مسلم' کتاب النکاح' باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیه ووجد مؤنه۔

اور اس رشتے کو اللہ کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی سورتوں کے ناموں میں بھی اللہ کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ سورۃ الروم میں میاں بیوی کے رشتے کا ذکر ہے' کیونکہ جنسی بے راہ روی کے کلچر کو پہلی مرتبہ رومیوں نے انتہا کو پہنچایا اور اب صدیوں بعد دوبارہ اس کلچر کو اَوجِ کمال تک پہنچانے والے وہ ہیں جو خود کو رومیوں کا جانشین کہتے ہیں۔ یہ ایسا کلچر ہے جو میاں بیوی کے جائز رشتے کا مخالف ہے اور ہم جنس پرستی کا درس دیتا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو شادی کے مقدس رشتے میں بندھنے کی بجائے ویلنٹائن ڈے جیسے تہواروں میں اخلاق باختگی کا درس دیتا ہے۔ یہ ایسا کلچر ہے جو ضبطِ ولادت کا درس دیتا ہے' کیونکہ بچوں کی پیدائش سے میاں بیوی کا تعلق مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا کلچر ہے جس میں طوائف کی عزت ماں سے زیادہ کی جاتی ہے' کیونکہ طوائف گھر سے باہر نکل کر پیسہ کماتی ہے جبکہ ماں گھر میں رہ کر بچوں کی تربیت کرتی ہے۔

کثرت حق کا معیار نہیں ہوتی

ہمیں اپنے اردگرد میڈیا کی ''برکات'' کی وجہ سے برائی کی کثرت سے کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ﴾

(المائدۃ: ۱۰۰)

''(اے پیغمبرؐ!) ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں' خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو۔''

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ)

''اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے:

''نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے تھوڑے''۔

حق اور باطل کی پہچان کثرت نہیں بلکہ قرآن وسنت رسول ﷺ ہے۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترے گی وہی حق ہے۔ بقول اقبال ؎

باطل دوئی پسند ہے' حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

❁❁❁

مسلمان کا طرزِ حیات (۵۶)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنهاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات

چودھواں باب

قربانی اور عقیقہ

① اُضحیہ (قربانی)

۱) تعریف

اُضحیہ سے مراد وہ بکری ہے جو عید کے دن ضحیٰ کے وقت اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کی جاتی ہے۔

۲) قربانی کا حکم

قربانی ایک ایسی سنت ہے جو ہر اُس مسلمان گھرانے پر واجب ہے جسے اس کی استطاعت ہے۔اس کے وجوب کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ﴾ (الکوثر)

''پس اپنے ربّ کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر''۔

اور جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَلْيُعِدْ)) (۱)

''جس نے نماز سے پہلے جانور ذبح کیا ہے وہ دوبارہ جانور ذبح کرے۔''

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

كَانَ الرَّجُلُ يُضَحِّيْ بِالشَّاةِ عَنْهُ وَعَنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ (۲)

''آدمی (رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں) اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک ہی بکری ذبح کر دیا کرتا تھا۔''

۳) فضیلت

قربانی کی سنت ادا کرنے کی بہت فضیلت ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ يَوْمَ النَّحْرِ عَمَلًا اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ هِرَاقَةِ دَمٍ، وَاِنَّهٗ لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاَشْعَارِهَا، وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا)) (۳)

''قربانی کے دن ابنِ آدم کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ عزوجل کو خون بہانے سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) یقیناً قیامت کے دن سینگوں، کُھروں اور بالوں سمیت حاضر ہوگا۔ اور (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کر لیتا ہے، لہٰذا خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔''

نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا: یہ قربانیاں کیا ہیں؟ تو حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے جدّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے''۔ صحابہ نے عرض کیا: اس سے ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا: ''ہر بال کے بدلے نیکی۔'' انہوں نے عرض کیا: ''اور اُون؟'' فرمایا: ''اُون کے بھی ہر بال کے بدلے نیکی ملے گی''۔ (٤)

۴) قربانی کی حکمتیں

قربانی میں بہت سی حکمتیں ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (الکوثر)

''پس نماز ادا کر اپنے ربّ کے لیے اور قربانی کر!''

اور:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام)

''(آپؐ) کہہ دیجیے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے''۔

(۲) امام الموحدّین حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت زندہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے یہ حکم دیا تھا کہ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں۔ پھر ان کے بدلے ایک مینڈھا عطا فرما دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ مینڈھا ذبح کر دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ﴾ (الصّٰفّٰت)

''اور ہم نے ایک عظیم ذبیحہ کو اُن کا فدیہ بنا دیا''۔

(۳) عید کے دن بال بچوں پر کھانے پینے کی چیزوں میں فراخی اور عام غریبوں اور مسکینوں سے رحم دلی کا سلوک۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے مویشیوں کا ہمیں مالک بنایا ہے' اللہ کی اس نعمت کا شکر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ﴾ (الحج:۳۶'۳۷)

''پس اس میں سے (یعنی قربانی کے گوشت میں سے) خود بھی کھاؤ' قناعت کرنے والے کو بھی کھلاؤ اور (دوسروں کی) سخاوت کی اُمید رکھنے والے کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو اسی طرح تمہارے بس میں کر دیا ہے' تاکہ تم شکر کرو۔ اللہ کو نہ ان کے گوشت پہنچیں گے نہ ان کے خون' لیکن اسے تمہارا تقویٰ پہنچ جائے گا۔''

(۵) قربانی کے احکام

(۱) قربانی کے جانور کی عمر: قربانی میں بھیڑ یا مینڈھا کم از کم ''جذع'' ہونا ضروری ہے' یعنی ایک سال کا پورا ہو چکا ہو یا ہونے والا ہو۔ دوسرے جانور یعنی بکری' گائے اور اونٹ

میں کم از کم ''دو دانت'' ہونا ضروری ہے۔ بکری اُس وقت ''دو دانت''[۵] ہوتی ہے جب وہ ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگ جائے۔ اور اونٹ جب چار سال کا ہو کر پانچویں میں لگے تب ''دو دانت'' ہوتا ہے۔ گائے جب دو سال کی ہو کر تیسرے سال میں داخل ہو تب مُسِنّہ (دو دانت) ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يَعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذَعَةً مِنَ الضَّاْنِ))[۶]

''صرف مُسِنّہ ذبح کرو سوائے اس صورت کے کہ تم پر (مُسِنّہ کی تلاش) مشکل ہو جائے پھر بھیڑ کا جذعہ ذبح کر دو۔''

(۲) جانور کا صحیح سلامت ہونا: قربانی صرف اسی جانور کی جائز ہے جو ہر قسم کے جسمانی نقص سے پاک ہو۔ چنانچہ کانا، لنگڑا، ٹوٹے ہوئے سینگ والا، کن کٹا، بیمار یا انتہائی لاغر جانور ذبح کرنا درست نہیں۔ ارشاد نبویؐ ہے:

((اَرْبَعٌ لَا تَجُوْزُ فِي الْاَضَاحِيِّ : اَلْعَوْرَاءُ بَيِّنٌ عَوَرُهَا وَالْمَرِيْضَةُ بَيِّنٌ مَرَضُهَا وَالْعَرْجَاءُ بَيِّنٌ ضَلْعُهَا وَالْكَسِيْرُ الَّتِيْ لَا تَنْقَى))[۷]

''قربانی میں چار جانور جائز نہیں: وہ کانا جانور جس کا یہ عیب واضح ہو، وہ بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو، وہ لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن واضح ہو، وہ بوڑھا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔'' یعنی جو دبلا پتلا اور انتہائی کمزور ہو۔

(۳) افضل قربانی: قربانی میں ایسا مینڈھا ذبح کرنا زیادہ افضل ہے جو سینگوں والا ہو، نسل کشی کے قابل ہو، سفید رنگ کا ہو جس کے پاؤں میں اور آنکھوں کے گرد سیاہی ہو۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کا جانور پسند کر کے قربان کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَمَرَ بِكَبْشٍ اَقْرَنَ يَطَأُ فِيْ سَوَادٍ وَيَبْرُكُ فِيْ سَوَادٍ وَيَنْظُرُ فِيْ سَوَادٍ[۸]

''جناب نبی ﷺ نے ایک سینگوں والے مینڈھے کی قربانی کی، جو سیاہی میں پاؤں رکھتا، سیاہی میں بیٹھتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔''

(۴) ذبح کرنے کا وقت: قربانی کا وقت عید کے دن صبح کو نمازِ عید کے بعد ہے۔ اس سے پہلے قربانی نہیں ہوتی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَاِنَّمَا ذَبَحَ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهٗ وَاَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ))(۹)

''جس نے نماز سے پہلے جانور ذبح کیا تو اس نے اپنے لیے ذبح کیا' اور جس نے نماز کے بعد ذبح کیا اس کی قربانی مکمل ہوگئی اور اسے مسلمانوں کا طریقہ حاصل ہوگیا۔''

عید کے دن کے بعد اگر قربانی کی جائے تو عید سے دوسرے تیسرے دن بھی ہوسکتی ہے' کیونکہ ایک روایت میں آتا ہے:

((كُلُّ اَيَّامِ التَّشْرِيْقِ ذَبْحٌ))(۱۰)

''سب کے سب ایامِ تشریق(۱۱) ذبح کرنے کے دن ہیں۔''

(۵) کس طرح ذبح کرنا مستحب ہے: مستحب یہ ہے کہ قربانی کے جانور کا مُنہ قبلہ کی طرف کرے اور یہ دعا پڑھے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَo اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَo لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

''میں نے اپنا چہرہ سب سے ہٹا کر اس (اللہ) کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز' اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں' اور مجھے اسی بات کا حکم ہوا ہے اور سب سے پہلے میں اطاعت قبول کرتا ہوں۔''

پھر جب جانور پر چھری چلانے لگے تو کہے: بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ' اَللّٰهُمَّ هٰذَا لَكَ وَمِنْكَ ''اللہ کے نام سے ذبح کرتا ہوں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اے اللہ! یہ تیرے لیے ہے اور تجھ سے (ہی مجھے ملا) ہے''۔

(۶) کسی سے ذبح کرانا: مستحب تو یہ ہے کہ اپنی قربانی کو خود ذبح کیا جائے۔ لیکن اگر کسی اور کو ذبح کرنے کو کہہ دے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

(۷) گوشت کی تقسیم: گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کرنا مستحب ہے۔ ایک حصہ گھر

والے کھالیں' ایک حصہ صدقہ کر دیا جائے اور ایک حصہ دوستوں کو بطور ہدیہ دے دیا جائے۔
جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُوْا وَاَطْعِمُوْا وَاحْبِسُوْا اَوِادَّخِرُوْا)) (۱۲)

''خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور ذخیرہ بھی کرو۔''

یہ بھی جائز ہے کہ سارا گوشت صدقہ کر دیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ تحفہ کے طور پر نہ دیا جائے' بلکہ کچھ کھا لیا جائے اور کچھ صدقہ کر دیا جائے۔

(۸) قصاب کی اُجرت: قصاب کو اُجرت کے طور پر قربانی کے گوشت میں سے کچھ گوشت دینا درست نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰی بُدْنِهٖ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا وَجُلُوْدِهَا وَاَجِلَّتِهَا' وَاَنْ لَا اُعْطِیَ الْجَزَّارَ مِنْهَا' قَالَ : نَحْنُ نُعْطِیْهِ مِنْ عِنْدِنَا (۱۳)

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اونٹوں کی (قربانی کی) نگرانی کرنے کا حکم دیا' اور یہ حکم دیا کہ میں ان کا گوشت' ان کی کھالیں اور ان کے جھول صدقہ کر دوں اور قصاب کو ان میں سے کچھ نہ دوں''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم قصاب کو اپنے پاس سے اجرت دیتے ہیں۔''

(۹) پورے گھر کی طرف سے ایک بکری: تمام گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دے دی جائے تو کافی ہے' اگرچہ وہ کافی افراد ہوں۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

كَانَ الرَّجُلُ يُضَحِّیْ بِالشَّاةِ عَنْهُ وَعَنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ (۱٤)

''(رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں) ہر شخص اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک ہی بکری قربان کر دیا کرتا تھا''۔

(۱۰) قربانی کرنے والا پرہیز کرے: جو شخص قربانی دینے کا ارادہ رکھتا ہے اس کے لیے ذوالحجہ کا چاند نظر آ جانے کے بعد قربانی دینے تک بال یا ناخن کاٹنا سخت مکروہ ہے۔
جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا رَاَيْتُمْ هِلَالَ ذِی الْحِجَّةِ وَاَرَادَ اَحَدُكُمْ اَنْ يُضَحِّیَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهٖ وَاَظْفَارِهٖ)) (۱۵)

''جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو' اور کوئی شخص قربانی کرنا چاہے تو وہ (قربانی کرنے تک)

اپنے بال اور ناخن کاٹنے سے رُکا رہے۔''

(۱۱) اُمت کی طرف سے قربانی : جس شخص کو اتنی استطاعت حاصل نہیں کہ قربانی کر سکے' اسے بھی اتنا ثواب مل جائے گا جتنا قربانی کرنے والے کو ملتا ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے دو مینڈھے ذبح کیے اور ایک مینڈھے کو ذبح کرتے وقت فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا عَنِّیْ وَعَمَّنْ لَمْ یُضَحِّ مِنْ اُمَّتِیْ))(۱۶)

''اے پروردگار! یہ میری طرف سے اور میری اُمت کے ان افراد کی طرف سے ہے جنہوں نے قربانی نہیں کی۔''

② عقیقہ

(۱) تعریف

عقیقہ اس بکری کو کہتے ہیں جو بچے کے لیے پیدائش کے ساتویں دن ذبح کی جاتی ہے۔

(۲) حکم

عقیقہ سنت مؤکدہ ہے۔ بچہ کے سرپرستوں میں سے جو شخص طاقت رکھتا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ عقیقہ کرے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((کُلُّ غُلَامٍ رَھِیْنَۃٌ بِعَقِیْقَتِہٖ تُذْبَحُ عَنْہُ یَوْمَ سَابِعِہٖ وَیُحْلَقُ وَیُسَمّٰی))(۱۷)

''ہر لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے گروی رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اور اس کے سر کے بال اُتارے جائیں اور اس کا نام رکھا جائے۔''

(۳) حکمت

عقیقہ اولاد کی نعمت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے' تاکہ اللہ تعالیٰ اس بچے کی حفاظت فرمائے۔

(۴) عقیقہ کے احکام

(۱) جانور کی عمر اور عیوب سے سلامتی : جس عمر کا جانور قربانی میں درست ہے اسی عمر کا جانور عقیقہ میں ذبح کیا جا سکتا ہے اور جن عیوب سے قربانی کا جانور پاک ہونا چاہیے انہی

عیوب سے عقیقہ کا جانور بھی پاک ہونا چاہیے۔

(۲) جانور کا گوشت: جس طرح قربانی کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے عقیقہ کا گوشت بھی اسی طرح تقسیم کرنا مستحب ہے، یعنی کچھ گوشت گھر والے خود کھالیں، کچھ صدقہ کر دیں اور کچھ دوست احباب میں تقسیم کر دیں۔

(۳) عقیقہ کے دن مستحب اعمال: لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرنا مستحب ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے عقیقہ میں دو مینڈھے ذبح کیے تھے۔(۱۸) اسی طرح ساتویں دن بچے کا نام رکھنا بھی مستحب ہے۔ بچے کا اچھا نام رکھنا چاہیے، اس کے سر کے بال اتارے جائیں اور بالوں کے وزن کے برابر سونا چاندی یا اس کی قیمت کے برابر نقد رقم صدقہ کرنی چاہیے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ غُلَامٍ رَهِيْنَةٌ بِعَقِيْقَتِهٖ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهٖ وَيُحْلَقُ وَيُسَمّٰى))(۱۹)

''ہر لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہوتا ہے۔ ساتویں دن اس کی طرف سے جانور قربان کیا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے''۔

(۴) بچے کے کانوں میں اذان اور اقامت: ولادت کے بعد بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنا علماء کے ہاں مستحب ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے بچہ اُم الصّبیان سے محفوظ رہے گا۔ روایت ہے کہ:

مَنْ وُلِدَ لَهٗ مَوْلُوْدٌ فَاَذَّنَ فِيْ اُذُنِهِ الْيُمْنٰى وَاَقَامَ فِيْ اُذُنِهِ الْيُسْرٰى لَمْ تَضُرَّهٗ اُمُّ الصِّبْيَانِ(۲۰)

''جس کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہہ دے تو اسے اُم الصبیان سے تکلیف نہیں پہنچے گی''۔

(۵) اگر ساتویں دن عقیقہ نہ ہو سکے تو چودھویں دن یا اکیسویں دن جانور ذبح کرنا بھی درست ہے(۲۱)۔ اگر ساتویں دن سے پہلے بچہ فوت ہو جائے تو اس کا عقیقہ نہیں کیا جائے گا۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاضاحی، باب ما یشتھی من اللحم یوم النحر۔ وصحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب وقتھا۔

(۲) جامع الترمذی، کتاب الاضاحی عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء ان الشاۃ الواحدۃ تجزئ عن اھل البیت۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الاضاحی، باب ثواب الاضحیۃ۔وجامع الترمذی، کتاب الاضاحی عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء فی فضل الاضحیۃ۔ ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے۔

(٤) سنن ابن ماجہ، کتاب الاضاحی، باب ثواب الاضحیۃ (اس کی سند میں ایک راوی ابوداؤد نفیع بن حارث جھوٹا آدمی ہے۔ وجامع الترمذی، کتاب الاضاحی، باب ما جاء فی فضل الاضحیۃ (امام ترمذی نے اسے صیغہ تمریض یعنی شک کے لفظ سے روایت کیا ہے)

(٥) جانوروں کی عمر کا اندازہ ان کے دانتوں سے لگایا جاتا ہے۔ جب کسی جانور کے دودھ کے دو دانت ٹوٹ جائیں تو اسے ''مسنّہ'' کہتے ہیں۔ اور دانت عام طور پر مذکورہ بالا عمر میں ٹوٹتے ہیں اور نئے اُگ آتے ہیں۔ مُسِنّہ ہونے سے پہلے جانور ''جذعہ'' کہلاتا ہے۔

(٦) صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب سنّ الاضحیۃ۔

(۷) سنن ابی داوٗد، کتاب الضحایا، باب ما یکرہ من الضحایا۔

(۸) صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب استحباب الضحیۃ وذبحھا مباشرۃ بلا توکیل والتسمیۃ..... یہاں ''سیاہی میں چلتا تھا، سیاہی میں بیٹھتا تھا اور سیاہی میں دیکھتا تھا'' سے مراد ہے کہ اس کے پاؤں بھی سیاہ تھے، پیٹ بھی سیاہ تھا اور آنکھوں کے پاس کی جگہ بھی سیاہ تھی۔ وجامع الترمذی ، کتاب الاضاحی عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء ما یستحب من الاضاحی۔ اس میں یہ لفظ ہیں: ''وہ سیاہی میں کھاتا، سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا''۔

(۹) صحیح البخاری، کتاب الاضاحی، باب سنۃ الاضحیۃ۔

(۱۰) مسند احمد، جلد ٤، ص ۸۲۔ اس حدیث کی سند میں علماء نے کلام کیا ہے۔ البتہ اس کی تائید میں حضرت علی ؓ اور حضرت ابن عباس ؓ وغیرہ کے اقوال موجود ہیں۔ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بارہ ذوالحجہ کے بعد قربانی نہیں کرنی چاہیے۔ حضرات عمر اور ابن عمر ؓ سے بھی اسی قسم کا قول مروی ہے۔

(۱۱) یعنی گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ۔

(۱۲) صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب بیان ما کان من النھی عن اکل لحوم الاضاحی بعد ثلاث فی اول الاسلام وبیان نسخہ۔

(۱۳) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب یتصدق بجلود الھدی۔ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی الصدقۃ بلحوم الھدی وجلودھا وجلالھا ۔

(١٤) جامع الترمذی، کتاب الاضاحی عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء ان الشاة الواحدة تجزی عن اهل البیت۔

(١٥) صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب نهی من دخل علیه عشر ذی الحجة وهو مرید التضحیة ان یاخذ من شعره او اظفاره شیئا۔

(١٦) مسند احمد۔ وسنن ابی داوٗد، کتاب الضحایا، باب فی الشاة یضحی بها عن جماعة۔ وجامع الترمذی، کتاب الاضاحی، باب العقیقة بشاة۔

(١٧) سنن ابی داوٗد، کتاب الضحایا، باب فی العقیقة۔ ومسند احمد۔ وسنن الدارمی، باب السنة فی العقیقة۔

(١٨) جامع الترمذی، کتاب الاضاحی، باب ما جاء فی العقیقة **میں لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم مذکور ہے۔ اس کتاب میں** باب العقیقة بشاةٍ **میں حضرت حسن کی طرف سے ایک بکری قربان کرنے کا ذکر ہے، لیکن امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی سند متصل نہیں۔**

(١٩) **حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔**

(٢٠) الکامل فی الضعفاء لابن عدی ٢٤/٩۔ وميزان الاعتدال للذهبی ٣٩٧/٤۔ **محدثین کے نزدیک یہ حدیث سخت ضعیف اور باطل ہے۔ امام البانیؒ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ دیکھئے:** السلسلة الضعیفة، ح ٣٢١ و ضعیف الجامع، ح ٥٨٨١۔ **فاضل مؤلف نے اسے ابن السنی کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ابن السنی کے مطابق یہ مرفوع حدیث ہے۔**

(٢١) **امام ترمذی نے** کتاب الاضاحی، باب٢٣ **میں یہ حدیث بیان فرمائی ہے ''لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہوتا ہے.....'' اس کے بعد فرمایا: ''اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ وہ لڑکے کی طرف سے ساتویں دن جانور ذبح کرنے کو مستحب فرماتے ہیں۔ اگر ساتویں دن نہ ہو سکے تو چودہویں دن اور اگر چودہویں دن مہیا نہ ہو سکے تو اکیسویں دن عقیقہ کیا جائے''۔**

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (40)

تُرکی (8)

(TURKEY)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

مصطفیٰ کمال پاشا کے انتقال کے دوسرے دن 11 رنومبر 1938ء کو عصمت انونو ترکی کے صدر منتخب ہوئے اور 14 رمئی 1950ء تک صدر رہے۔ اس کے بعد انہوں نے دس سال تک پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ فوجی انقلاب کے بعد جب مخلوط حکومت قائم ہوئی تو عصمت انونو 20 نومبر 1961ء سے 13 رفروری 1965ء تک دوبارہ وزیراعظم رہے۔ اس کے بعد دوبارہ حزبِ اختلاف میں چلے گئے۔ 25 دسمبر 1973ء کو ان کا انتقال ہوا۔

عصمت انونو کے ساڑھے بارہ سالہ دورِ صدارت میں کئی اہم واقعات پیش آئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد شام پر فرانس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ سکندرونہ اور انطاکیہ کے ساحلی اضلاع اس وقت شام میں شامل تھے' لیکن ترکوں کا دعویٰ تھا کہ یہ ترکی کے علاقے ہیں۔ یہاں کی آبادی ترکوں' عربوں اور ارمنی باشندوں پر مشتمل تھی' لیکن ترکوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ شام بھی اِن اضلاع کا دعوے دار تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے اسکندرونہ اور انطاکیہ کے علاقوں میں مئی 1937ء میں نیم خودمختار حکومت قائم کر دی گئی تھی۔ اس حکومت کی اسمبلی کے چالیس ارکان میں سے بائیس ترک تھے۔ اسمبلی نے اتفاق رائے سے ترکی سے الحاق کا فیصلہ کیا اور 23 جولائی 1939ء کو یہ دونوں اضلاع ترکی میں شامل ہو گئے۔ انطاکیہ کا نام بدل کر ھطائے (Hatay) رکھ دیا گیا۔

عصمت انونو کے دَور کا دوسرا اہم واقعہ اُن جلاوطن رہنماؤں کی واپسی ہے جن کو کمال پاشا نے ملک بدر کر دیا تھا۔ پابندی اٹھنے کے بعد یہ رہنما' جن میں ڈاکٹر عدنان آدیوار' خالدہ ادیب خانم اور رؤف بے شامل تھے' اپنے وطن واپس آ گئے۔

دوسری جنگ عظیم

دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) بھی عصمت انونو کے زمانۂ صدارت میں ہوئی۔ اس جنگ میں ترکی مصطفیٰ کمال کی ''اندر امن، باہر امن'' کی خارجہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود غیر جانب دار رہا، جس کی وجہ سے وہ جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا۔ ترکی نے دونوں فریقوں کے دباؤ کا مقابلہ کیا اور جرمنی کے خلاف 23 فروری 1945ء کو صرف اس وقت جنگ کرنے کا اعلان کیا جب اتحادیوں نے یہ اعلان کیا کہ انجمنِ اقوام (لیگ آف نیشنز) میں صرف ان ملکوں کو مدعو کیا جائے گا جو جرمنی سے برسرِ جنگ ہوں گے۔ اُس وقت تک جرمنی بھی جنگ ہار چکا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد روس نے ترکی کے شمال مشرقی اضلاع قرص اور اردھان پر ملکیت کا دعویٰ کر دیا، حالانکہ 16 مارچ 1921ء کو ترکی سے ایک معاہدے کے تحت وہ ان علاقوں سے دست بردار ہو چکا تھا اور ترکی روسی جارجیا کے شہر باطوم سے، جس پر کاظم قرہ بکر پاشا کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، دست بردار ہو گیا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد روس اپنے عہد نامے سے منحرف ہو گیا۔ اُس نے صرف قرص اور اردھان کی واپسی ہی کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ باسفورس اور دردانیال کے دفاع میں بھی روس کو شریک کرنے کا مطالبہ کیا۔ روس کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ترکی کی سلامتی کو خطرہ پیدا ہو گیا اور روس کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنے کے لیے ترکی کو امریکہ سے فوجی امداد حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اسرائیل کو تسلیم کرنا

عصمت انونو کے عہد کی خارجہ پالیسی کا ایک افسوس ناک واقعہ 28/مارچ 1949ء کو اسرائیل کی یہودی حکومت کو تسلیم کرنا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ روس کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے ترکی اپنے دفاع کے لیے مغربی ملکوں کا زیادہ سے زیادہ محتاج ہوتا جا رہا تھا۔ ترکی نے اسرائیل کو از روئے قانون نہیں، بلکہ حقیقت یا ضرورت کے طور پر تسلیم کیا۔ اس فیصلے سے عربوں اور ترکوں کے تعلقات میں، جو معمول پر آتے جا رہے تھے، ایک بار پھر کشیدگی پیدا ہو گئی۔

عصمت انونو کے دورِ حکومت کا ایک اہم کارنامہ زرعی اصلاحات کا نفاذ ہے، جس پر 1945ء سے عمل درآمد شروع ہوا۔ ان اصلاحات کے تحت بڑی بڑی زمینداریاں معاوضہ دے کر ختم کی گئیں اور فاضل زمین چھوٹے کاشت کاروں میں تقسیم کی گئی۔ ان اصلاحات کی وجہ سے دیہی علاقوں میں خوشحالی پیدا ہوئی۔

ڈیموکریٹک پارٹی

عصمت انونو کے دورِ صدارت کا سب سے اہم واقعہ حقیقی جمہوریت کی بحالی ہے۔ مصطفیٰ کمال

پاشا کے عہد میں اگرچہ ترکی کا سیاسی ڈھانچہ بنیادی طور پر جمہوری تھا' لیکن کمال پاشا نے حکومت آمرانہ انداز سے کی۔ ملک میں اس تمام عرصے میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی کام کر سکتی تھی' اور وہ تھی ''خلق پارٹی'' جسے انگریزی میں پیپلز پارٹی کہا گیا۔ شروع میں کمال پاشا نے ''پروگریسوری پبلکن پارٹی'' کے نام سے ایک اور سیاسی پارٹی قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ ری پبلکن پارٹی 17 رنومبر 1924ء کو مشرقی ترکی کے فوجی کمانڈر کاظم قرہ بکر پاشا نے قائم کی تھی۔ کاظم قرہ بکر پاشا پہلے شخص تھے جنہوں نے مشرقی ترکی میں تحریک آزادی کی تنظیم قائم کی تھی۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ وہ اتاترک کے خیالات کے مخالف تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے کئی ممتاز رہنماؤں سے مل کر کمال پاشا کی پیپلز پارٹی سے استعفاء دے کر ''پروگریسو'' جماعت قائم کی' تاکہ استبدادی رجحانات کا مقابلہ کیا جا سکے اور اسلام کا تحفظ کیا جا سکے' لیکن کمال پاشا نے کردستان کو بہانہ بنا کر 5 رجون 1935ء کو یہ جماعت توڑ دی۔

گویا اس طرح 1924ء سے 1946ء تک ترکی پر صرف ایک ''خلق پارٹی'' حکومت کرتی رہی۔ عصمت انونو کو اپنے آخری دَور میں عوامی دباؤ کے تحت کئی مفید اصلاحات کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ملک میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ ترکی میں کئی سیاسی جماعتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں ''ڈیموکریٹک پارٹی'' سب سے اہم تھی۔ یہ سیاسی جماعت 1946ء میں جلال بایار نے عدنان مندریس' رفیق کورالتن اور فواد کو پیرولو کے تعاون سے قائم کی تھی۔ ان دونوں رہنماؤں نے ترکی کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور عصمت انونو کے عہد میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے تھے۔ اُسی زمانے میں ترکی کے کمانڈر انچیف مارشل فوزی چقماق نے بھی ''ملت پارٹی'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی تھی' لیکن 1950ء میں مارشل چقماق کے انتقال کی وجہ سے یہ جماعت نمایاں نہ ہو سکی۔

سیاسی آزادی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حکومت کی کارروائی پر کھل کر تنقیدیں ہونے لگیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی اور ملت پارٹی کو حکومت کی مذہبی پالیسی پر خاص اعتراض تھا۔ گزشتہ چوبیس سال کے عرصے میں حکومت نے مذہب اسلام کو جو ضعف پہنچایا اور جس طرح اسلامی افکار و تعلیمات کو کچلنے کی کوشش کی' اس پر اب ہر طرف سے اعتراض ہونے لگے۔ چنانچہ عوامی دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو 1948ء میں پرائمری سکولوں میں اسلامی تعلیم کی اجازت دینا پڑی۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے جولائی 1946ء کے الیکشن میں پہلی مرتبہ حصہ لیا' لیکن جماعت کو قائم ہوئے چونکہ ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے' اس لیے اس الیکشن میں اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن چار سال بعد 1950ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی اس کامیابی کی دو بڑی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس پارٹی کے رہنماؤں

نے مکمل مذہبی آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ صحافیوں نے لکھا کہ اس وقت ترکی میں اسلام کے اثرات اتنے شدید ہیں کہ ہر سطح کے سیاسی رہنما دیہات سے ووٹ لینے کے لیے مجبور ہیں' اس لیے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ اور وفادار ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ کامیابی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سوشلزم کے اصول کی بنا پر صنعتی اداروں اور کارخانوں کو قومی ملکیت کی بجائے نجی ملکیت میں چلانے کی حمایت کی۔ چونکہ گزشتہ چوبیس سال کے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ سرکاری ملکیت میں کارخانے کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔

عصمت انونو اگرچہ نظریاتی طور پر اتاترک کے اصولوں کے بہت بڑے علم بردار تھے' لیکن اُن کے مخالفین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے دورِ صدارت میں استبداد اور آمریت کا رویہ اختیار کیا' سوشلسٹ عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور ترکی میں اسلامی رجحانات ونظریات کی اشاعت کو روکا۔ اُن کے مخالف اتاترک کے دَور کی غلطیوں اور خامیوں کا ذمہ دار بھی عصمت انونو کو قرار دیتے ہیں' جو اتاترک کے پورے دورِ صدارت میں وزیراعظم کے منصب پر فائز رہے۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت بھی اُن ہی کے دورِ صدارت میں ملی اور صدارت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی ترکی میں جمہوریت کو زندہ رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔

جلال بایار کا دورِ صدارت

1950ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی کے بعد جلال بایار صدر اور عدنان مندریس وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اتاترک اور عصمت انونو بنیادی طور پر فوجی تھے۔ اس کے برخلاف جلال بایار اور عدنان مندریس غیر فوجی رہنما تھے۔ جلال بایار صدارت کے منصب پر 27 مئی 1961ء کے فوجی انقلاب تک فائز رہے۔ فوجی حکومت نے جب مقدمہ چلا کر عدنان مندریس کو پھانسی دی تو جلال بایار کو بھی سزائے موت سنائی گئی' جو اُن کی ضعیف العمری کی وجہ سے سزائے عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ پارلیمان کی بحالی کے بعد اُن کی سزا ختم کر دی گئی۔ انہوں نے اخیر عمر میں اپنی زندگی کی سرگزشت لکھی۔ یہ سرگزشت آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ''Ben de yazdim'' ہے۔

عدنان مندریس کی وزارتِ عظمیٰ

ڈیموکریٹک پارٹی کے دس سالہ دورِ حکومت میں اگرچہ صدارت کے عہدے پر جلال بایار فائز رہے' لیکن اس عہد کے اصل روحِ رواں وزیراعظم عدنان مندریس تھے۔ اُن کا تعلق زراعت پیشہ خاندان سے تھا۔ اُن کو ذاتی طور پر بھی زراعت سے گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے کمال اتاترک اور عصمت انونو کے عہد میں علاقہ آیدن کو سیلابوں سے بچانے اور زراعت کی ترقی کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اُن کی کوششوں سے اس علاقے میں ساٹھ ہزار ایکڑ پر مشتمل دلدلوں کو

خشک کیا گیا اور اس وسیع علاقے کو قابلِ کاشت بنایا گیا۔ انہوں نے یہاں نہریں کھدوائیں، پل بنوائے اور جدید میکانکی کاشت کو رواج دیا۔ انہوں نے اپنے ذاتی زرعی فارموں میں ایسے تجربے کیے جو ترکی کی زراعت میں ماڈل بن گئے۔ جب ترکی میں خاندانی نام اختیار کرنے کا قانون بنا تو عدنان بے نے اپنے لیے مندریس کا نام اختیار کیا جو مشرقی ترکی کا ایک اہم دریا ہے اور اس علاقے میں زرعی خوشحالی کا باعث ہے۔ عصمت انونو کے صدر ہونے کے بعد عدنان مندریس کے اُن سے اختلافات ہو گئے۔ وہ 1930ء سے 1938ء تک کمال اتاترک کی ''خلق پارٹی'' سے وابستہ رہنے کے بعد اس جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور جب ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت ہو گئی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے 7/جنوری 1946ء کو نئی سیاسی جماعت ''ڈیموکریٹک پارٹی'' قائم کی۔ کمال اتاترک کے انتقال کے بعد سے جلال بایار اور مندریس ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھی رہے۔ 1950ء میں جب ڈیموکریٹک پارٹی نے خلق پارٹی کی 69 نشستوں کے مقابلے میں 408 نشستیں حاصل کر کے شاندار کامیابی حاصل کی تو جلال بایار صدر اور عدنان مندریس وزیراعظم منتخب ہوئے۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت سے ترکی میں جمہوریت کے جس دَور کا آغاز ہوا اس کو ''انقلابِ سفید'' کہا جاتا ہے، یعنی ایک ایسا انقلابی دور جس میں جمہوریت بحال ہوئی، عوام کو خوشحالی نصیب ہوئی اور ترک عوام کے لیے اسلام پر گامزن ہونے کی راہ میں عائد شدہ پابندیاں ختم ہوئیں۔ عدنان مندریس کو جمہوریت کا اصل معمار سمجھا جاتا ہے اور اُن کے دور کو مصطفیٰ کمال کے دور کا تسلسل سمجھا جاتا ہے، ایک ایسا تسلسل جس میں عصمت انونو کے دور نے خلیج حائل کر دی تھی۔

عدنان مندریس کے عہد میں دفاعی امور میں ترکی مغربی ملکوں کا اور زیادہ محتاج ہو گیا۔ جنگ کے بعد سے برطانیہ اور امریکہ وسیع پیمانے پر ترکی کو اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔ 24/اگست 1949ء کو جب روس کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ نے اپنے حواری ممالک کی مدد سے میثاقِ شمالی اوقیانوس (NATO) کے نام سے ایک دفاعی تنظیم قائم کی تو 1952ء میں ترکی بھی اس تنظیم میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد 24 فروری 1955ء کو ترکی نے مشرق وسطیٰ کی ایک اور دفاعی تنظیم ''معاہدۂ بغداد'' میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان معاہدوں کی وجہ سے ترکی پوری طرح مغربی بلاک سے وابستہ ہو گیا۔ مغربی ملکوں سے اس وابستگی کو اسلامی ممالک میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خصوصاً عرب ملکوں میں، جو فلسطین کی وجہ سے مغربی ملکوں کے خلاف صف آرا تھے۔ چنانچہ ترکی کے فیصلے کے خلاف ردِعمل اور شدید ہو گیا۔ لیکن ترکی کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں۔ اشتراکی روس کا مقابلہ صرف اس صورت میں کیا جا سکتا تھا کہ ترکی پوری طرح مغرب کے دفاعی نظام سے وابستہ ہو جائے۔

مذہبی آزادی

ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کے زمانے میں ترکی کی مذہبی پالیسی میں بھی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ ترکی میں 1932ء سے یہ پابندی عائد تھی کہ اذان اور تکبیر عربی میں نہیں کہی جا سکتی تھی' اور 1941ء سے اس حکم کی خلاف ورزی جرم قرار دے دی گئی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ 16 جون 1950ء کو ''مجلس کبیر ملی'' کی قرارداد کے ذریعے اس قانون کو منسوخ کر دیا اور اُسی دن عدنان مندریس وزیر اعظم نے تار کے ذریعے تمام صوبوں میں اطلاع روانہ کر دی کہ دوسرے دن سے ترکی میں اذان اور تکبیرِ اقامت عربی میں کہی جائے۔ 17 جون 1950ء ترکی کی تاریخ کا ایک یادگار دن ہے جب اٹھارہ سال کے بعد پہلی مرتبہ ترکی کے طول و عرض میں عربی میں اذان دی گئی۔

عدنان مندریس کے دورِ حکومت میں سڑکوں کے علاوہ مسجدیں بھی اس کثرت سے تعمیر کی گئیں کہ لوگ ان کو ''مسجدوں اور سڑکوں کا وزیر اعظم'' کہنے لگے۔ مندریس نے کمال اتاترک کے مقبرے کے سامنے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی اور اس کے لیے اپنی جیب سے ایک لاکھ لیرا دیے۔

''جمہور خلق پارٹی'' کے دور میں حج پر بھی پابندیاں تھیں۔ یہ پابندیاں بھی 1950ء میں اٹھالی گئیں اور اس سال پچیس سال کے بعد 423 ترکوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ اس کے بعد تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اب حاجیوں کی سالانہ تعداد ایک لاکھ سے کہیں زیادہ ہے۔ حج پر اب کسی قسم کی پابندی نہیں' بلکہ اس معاملے میں حکومت سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ ہر جہاز میں سرکاری خرچ پر مفتی فراہم کیے جاتے ہیں۔ حاجیوں کو لے جانے والے طیاروں میں ایئر ہوسٹس خواتین کے لیے پورا لباس پہننا لازمی ہوتا ہے' اور آب زم زم کے ڈبے کرائے کے بغیر مفت بھیجے جا سکتے ہیں۔

اتاترک کے زمانے میں 1925ء میں دینی مدارس یہ کہہ کر بند کر دیے گئے تھے کہ یہ ''برائی کے اڈے'' ہیں۔ اُس وقت دینی مدارس کی تعداد 242 تھی' لیکن پابندی کے دس سال بعد یہ تعداد صرف بیس رہ گئی۔ 1950ء میں پابندی اٹھنے کے بعد دینی مدرسے پھر قائم ہونا شروع ہو گئے۔ علاوہ ازیں سرکاری مدارس میں جہاں صرف دُنیوی تعلیم ہوتی تھی' مذہبی تعلیم کا نصاب بھی داخلِ درس کر دیا گیا۔ پانچویں اور چھٹی جماعت میں اسلامی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے شعبے جاری کیے گئے۔

عدنان مندریس کا ایک اور کارنامہ ''محکمہ امورِ مذہبی'' کا قیام ہے۔ اس محکمے نے اسلامی علوم کی توسیع و اشاعت اور عوام میں اسلامی روح پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ محکمہ امام اور خطیب تیار کرتا ہے۔ اس کے تحت ملک میں اعلیٰ اسلامی تعلیم کے مراکز قائم کیے جاتے ہیں۔ پرانی اور نئی اسلامی کتب

کے ترکی میں تراجم کرائے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈیموکریٹک پارٹی کے عہد میں وہ بیڑیاں بڑی حد تک کاٹ دی گئیں جو ترکی میں اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے پاؤں میں ڈال دی تھیں۔ عدنان مندریس اتاترک کے نظریات کے اس قدر مخالف تھے کہ اُن کے بارے میں کہا جاتا کہ اگر اُن کا بس چلے تو ملک سے اتاترک کی ایک ایک یادگار مٹا دیں۔

فوجی انقلاب

1950ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی نے جمہور خلق پارٹی کی 69 نشستوں کے مقابلے میں 408 نشستیں حاصل کی تھیں۔ 1954ء میں بھی ڈیموکریٹک پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے خلق پارٹی کی 31 نشستوں کے مقابلے میں 500 نشستیں حاصل کیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے عہد میں ترقیاتی منصوبوں میں وسیع سرمایہ کاری کی وجہ سے ملک میں گرانی پیدا ہوگئی۔ روزمرہ استعمال کی عام اشیاء میں مہنگائی کے سبب عوام میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ پھر بھی 1957ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کو خلق پارٹی کی 178 نشستوں کے مقابلے میں 420 نشستیں حاصل ہوئیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ''اتاترک کے بعد عدنان مندریس ترکی کے سب سے مقبول رہنما تھے''۔ عدنان نے اپنی اس غیر معمولی مقبولیت کے سہارے ترکی کے ان عناصر کی ہم نوائی شروع کر دی جو ترکی کے آئین سے سیکولرزم کی دفعہ نکالنا چاہتے تھے۔ مندریس نے اس بات پر زور دیا کہ سیکولرزم کا مطلب مذہب دشمنی نہیں بلکہ مذہبی معاملات میں حکومت کی عدم مداخلت ہے۔ اتاترک کے حامیوں کو ڈیموکریٹک پارٹی کی بہت سی اصلاحات پہلے ہی گراں گزر رہی تھیں۔ اب آئین میں تبدیلیاں کرنے کے رجحانات کی وجہ سے، جن میں فوج کے اختیارات گھٹانا بھی شامل تھا، 27 مئی 1960ء کو فوج نے، جس پر اتاترک عناصر کا غلبہ تھا، حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور جنرل جمال گرسل کے زیرِ صدارت فوجی حکومت قائم کر دی۔

فوجی حکومت نے جلال بایار، عدنان مندریس اور ڈیموکریٹک پارٹی کے دوسرے رہنماؤں پر آئین کی خلاف ورزی کے الزام میں ''نمائشی'' مقدمہ چلایا اور اس جرم میں پارٹی کے دو رہنماؤں کو 17 ستمبر 1961ء کو پھانسی دے دی۔ یہ دو رہنما عدنان مندریس اور وزیرِ خارجہ زورلو تھے۔ جلال بایار کو بھی سزائے موت سنائی گئی تھی، لیکن ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے یہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور اس کے ممتاز ارکان پر سیاست میں حصہ لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ (جاری ہے)